علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب

ALIGARH CONVOCATION ADDRESS 1949

– از: مولانا ابوالکلام آزاد

جناب نواب صاحب اور دوستو!

آپ کے وائس چانسلر صاحب نے جب یونیورسٹی کی جانب سے از راہ عنایت مجھے دعوت دی کہ اس سالانہ تقریب میں شریک ہوں اور مجلس سے خطاب کروں، قدرتی طور پر میرے ذہن میں بعض گزرے ہوئے واقعات کی یاد تازہ ہوگئی۔ ....

کیا فی الحقیقت میں سرسید مرحوم اور اُن کے اس قائم کیے ہوئے تعلیمی ادارے کا مخالف تھا؟ یا اس وقت کا زیادہ پسندیدہ لفظ استعمال کرتے ہوئے کہوں کہ دشمن تھا؟ واقعہ یہ ہے کہ میں ہو نہیں سکتا تھا، کیوں کہ میں اُن کے شاندار اصلاحی کارناموں کا معترف اور ان کی عظمت کا معتقد تھا۔ میری عمر اتنی نہیں تھی کہ سرسید مرحوم سے ملنے کی عزت حاصل کرسکتا، لیکن ان کے دو جانشینوں اور اُن کے حلقہ کے بعض بزرگوں کا زمانہ میں نے پایا تھا اور اُن کی خدمت میں مجھے نیازمندی حاصل تھی۔ میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی گزر چکا ہے، جب سرسید مرحوم کی تصنیفات نے میرے دماغ پر غیر معمولی اثر ڈالا تھا اور یہ میری طالب علمی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ بلاشبہ یہ اثر آگے چل کر دھیما پڑ گیا اور مجھے فکر و نظر کی دوسری منزلیں پیش آگئیں۔ تاہم میرا دماغ اُن کے مصلحانہ اعمال کے تاثر سے کبھی خالی نہیں ہوا۔ ....

.... میں یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ سرسید انیسویں صدی کے ایک بڑے ہندوستانی مصلح تھے اور انھوں نے ملک کے لیے شاندار اصلاحی اور تعلیمی خدمتیں انجام دیں۔ .... آج میں یہاں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ ان کی شاندار اصلاحی اور تعلیمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا خراجِ عقیدت پیش کروں۔

موجودہ زمانے میں جب کہ مغربی علوم کی تعلیم ہندوستانی زندگی کی ایک عام حقیقت بن گئی ہے اور ہم تعلیم کے لفظ کا اطلاق صرف اسی تعلیم پر کرنے لگے ہیں، بہت کم لوگ اُس جدوجہد کی دشواریوں کا صحیح اندازہ کرسکیں گے جو آج سے سو برس پہلے نئی تعلیم کے حامیوں کو پیش آئی تھیں انھیں صرف ایک نیا راستہ ہی نہیں دکھانا تھا اس راستے میں قدم قدم پر لڑنا تھا ان کی راہ قدامت پرستی کی بے شمار قوتوں سے رُکی ہوئی تھی جو ہمیشہ نئی تبدیلیوں کی راہ روکنا چاہتی ہیں۔ صدیوں کے اوہام و تعصّبات ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ طرح طرح کے دماغی عقائد اور جذباتی رجحانات برسرِ پیکار تھے۔ مخالف قوتوں کے ہاتھ میں ایک بڑا ہتھیار مذہب کا بھی تھا۔ مذہب کی راہ اصلاً علم اور عقل کی راہوں کی مخالف نہیں ہے لیکن اسے ہمیشہ مخالف بنالیا گیا ہے۔ وقت کا عام عقیدہ یہ تھا کہ مغربی علوم کی تعلیم لوگوں کو مذہب سے برگشتہ کردے گی اور اگر ہمیں مذہب عزیز ہے تو پُرانی تعلیم پر قناعت کر لینی چاہیے۔ دراصل یہ جنگ فکرِ انسانی کی تاریخ کا ایک عالمگیر خاصہ تھی۔ یورپ میں یہ کشاکش سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ہوئی اور مشرقی ممالک کا اُس سے سامنا انیسویں صدی میں ہوا۔ ہندوؤں میں یہ جنگ جلد شروع ہوئی اور جلد ختم ہوگئی مگر مسلمانوں میں اس نے بہت زیادہ وقت لیا۔ بالآخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوا ہے، وقت کے تقاضے فتح مند ہوئے، اور قدامت پرستی کو اپنی ہار مان لینی پڑی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، بلا خوف و ڈر کہا جاسکتا ہے کہ اس فیصلہ کن جنگ کا مردِ میدان وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی کے ایک گوشہ میں مدفون ہے۔ یہ جنگ اسی علی گڑھ میں لڑی گئی، اور یہی علی گڑھ اس کی فتح مندی کا یادگاری منارہ ہے۔

زمانہ حال کے بعض اہلِ قلم نے سرسید مرحوم کو راجہ رام موہن رائے سے تشبیہ دی ہے اور یہ بہت حد تک صحیح ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے جو کام بنگال میں کیا، وہی ان سے چالیس برس بعد سرسید نے شمالی ہند میں کیا اور خاص طور پر مسلمانوں میں کیا۔ دونوں میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ پہلے کے اصلاحی کاموں کا اصلی میدان مذہب تھا اور دوسرے کا تعلیم۔ اگرچہ دونوں نے اپنی اصلاحی اور تخلیقی قوتوں کی چھاپ وقت کی تمام فکری پیداوار پر لگادی تھی، مذہب، تعلیم، معاشرت، زبان، ادب، صحافت، سب میں ان کی اصلاحی روح آج بول رہی ہے۔

یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ سرسید مرحوم نے ملک کی سیاسی تحریک کی مخالفت کی تھی لیکن ان کی مخالفت میں ہندو مسلم سوال کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی مخالفت کی سرگرمیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو یکساں طور پر شریک کیا تھا۔ وہ مدت العمر ہندو مسلم یگانگت کے حامی رہے اور ہمیشہ ایسی باتوں کی مخالفت کرتے رہے جس سے دونوں جماعتوں کے باہمی اتفاق و یکجہتی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں بار بار یہ خوبصورت استعارہ دہرایا تھا کہ مادرِ ہند کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک آنکھ بھی بگڑ جائے گی تو اس کے چہرے کا سارا حسن بگڑ جائے گا۔

ہندوستانی قومیت کے متعلق ان کا جو خیال تھا، اس کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ ''ہندو'' لفظ کا مفہوم ان کے ذہن میں کیا تھا؟ لاہور کی ایک ہندو انجمن کے ممبروں کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

''مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ہندو کے معنی بہت محدود کردیئے۔ آپ نے اس کا اطلاق ایک خاص مذہبی گروہ پر کیا ہے مگر میری رائے میں یہ اطلاق صحیح نہیں ہے۔ میں اُن تمام لوگوں کو جو ہندوستان کے باشندے ہیں، ہندو تصور کرتا ہوں۔ خواہ وہ کسی نسل اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ میں نہایت خوشی اور فخر کے ساتھ اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہوں''۔

اگر ہندو اور مسلمانوں نے اس رائے کی روح کو سمجھا ہوتا اور اس کی پیروی کی ہوتی تو آج ملک کی تاریخ کا رُخ دوسرا ہوتا۔

سرسید مرحوم نے اس تعلیمی ادارے کی بنیاد ایک اہم مقصد سامنے رکھ کر ڈالی تھی۔ انھوں نے انگلستان کے تعلیمی نظام کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا اور یہ حقیقت معلوم کرلی تھی کہ اس نظام کی اصلی خصوصیت محض اس کی تعلیم ہی نہیں ہے بلکہ ایک خاص طرح کی تربیت ہے۔ یہی تربیت ہے جو نوجوانوں کی سیرت ڈھالتی ہے اور اس کے لیے ایک مضبوط اور بے لچک سانچا مہیا کردیتی ہے۔.... علی گڑھ کالج اس قسم کا پہلا ہندوستانی کالج تھا۔

○

مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کردیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہوگئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ ''تہذیب الاخلاق'' سے مرتب ہوئے۔ یہ رسالہ انھوں نے انگلستان کی سیاحت کے بعد نکالا تھا اور اس میں ان کے حلقہ کے رفیقوں کے مضامین

نکلا کرتے تھے۔ فی الحقیقت جدید اردو علم ادب کی بنیادیں اسی رسالہ نے استوار کیں اور اُسے اس قابل بنادیا کہ آج ہر طرح کے علمی اور ادبی مطالب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابل ذکر اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقہ کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں اردو کی نئی شاعری کی بنیاد اگر چہ لاہور میں پڑی تھی مگر اسے نشو ونما یہیں کی آب و ہوا میں ملی، اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں نئی قسم کی نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ اردو خطابت کی بھی پہلی درس گاہ یہی تھی۔ اس دور کے تمام مشہور مقرروں کو اسی حلقہ نے پیدا کیا تھا، اور اگر پیدا نہیں کیا تھا تو ان کے لیے پلیٹ فارم یہیں مہیا کیا گیا تھا۔

○

انیسویں صدی کا آخری نصف حصہ اکثر مشرقی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ایک طرح کا انتقالی دور تھا۔ اس دور میں ملک کی دماغی زندگی کے پُرانے سانچے ٹوٹ رہے تھے اور نئے سانچے ڈھلنا شروع ہوگئے تھے۔ پرانے ہندوستان کی مٹی ایک نئے ہندوستان کا ڈھانچا تعمیر کررہی تھی، اور پُرانے موسم کا اختتام ایک نئے موسم کی آمد کا اعلان تھا۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، کہا جاسکتا ہے کہ اس انتقالی دور کا سب سے زیادہ موثر عمل یہیں انجام پایا۔ نئے ہندوستان کے پیدا کرنے میں ملک کے جن حلقوں نے نمایاں حصہ لیا ہے، ان میں ایک حلقہ علیگڑھ کا بھی تھا جس نے ہندوستان کی نئی دماغی سرگرمیوں کے لیے انیسویں صدی میں ایک نشاۃ حدیثہ (رینے سانس) کا دور بہم پہنچایا۔

○

.... مجھے معلوم ہے کہ آپ کی درس گاہ کا پہلے دن سے ایسا ہی طرزِ عمل رہا ہے۔ آپ کی یہ درس گاہ جب نئی نئی قائم ہوئی تھی تو طالب علموں کی سب سے پہلی جماعت جو اس میں داخل ہوئی، اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی تھے۔ آپ کے اساتذہ کی صف میں بھی ہمیشہ سب کے لیے جگہ رہی۔ یہاں کے بعض ہندو پروفیسروں کا نام آج بھی یہاں کی تاریخ کے صفحات میں پڑھا جاسکتا ہے۔ آپ کا یہ قدیمی طرزِ عمل آئندہ اور زیادہ نمایاں ہوگا اور زیادہ وسعتیں پیدا کرے گا۔

○

اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ اور اس کی تحقیقات آپ کی درس گاہ کی قدیمی روایت ہے مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سرسید مرحوم کے دور کے بعد اس کی سرگرمیاں بہت کچھ دھیمی پڑگئیں، اور علم وفن کا عام مذاق بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رہا۔ یونیورسٹی قائم ہوئی تھی، تو اسے اپنے قیام کے ساتھ ایک نیا علمی دور لانا تھا، لیکن اس توقع کو بھی ابھی تک انتظار ہی کرنا پڑا ہے آپ کا فرض ہے کہ اپنی درس گاہ کی پُرانی روایتوں کو ازسرِ نو تازہ کریں اور یونیورسٹی کے اندر مطالعہ اور تحقیقات کا اعلیٰ معیار پیدا کردیں۔....

○

.... اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ آپ کی ادبی سرگرمیوں کو جولانیوں کے لیے اب اس سے بھی زیادہ وسیع میدان ملنا چاہیے۔ آپ کو ہندی علم ادب میں بھی پوری دلچسپی لینی چاہیے۔ زبان اور علم وادب کی تحصیل مسلمانوں کا تاریخی خاصہ رہا ہے، اور ہندی ادب کو جو دعویٰ ہندوستان کے ہندوؤں پر ہے، ویسا ہی دعویٰ ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی ہے۔ اردو کی طرح ہندی ادب کی ترقی میں بھی دونوں نے یکساں طور پر حصہ لیا تھا۔ ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ میں برج بھاشا کی شاعری کا جو نیا دور پیدا ہوا اس میں اگر ایک طرف اکبر اور جہانگیر کی فیاضانہ سرپرستیاں ہمارے سامنے آتی ہیں تو دوسری طرف محمد جائسی، خانخاناں اور عبدالجلیل بلگرامی جیسے شاعروں کا زندۂ جاوید کلام ہمیں یاد آجاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر تک ہم دیکھتے ہیں کہ برج بھاشا کے مسلمان شاعروں کی ایک بہت بڑی صف ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی اس پُرانی روایت کو پھر تازہ کریں، میں چاہتا ہوں کہ اب اس ادارے میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی پیدا ہو جو اردو اور ہندی دونوں کے یکساں طور پر ماہر ہوں۔

○

وقت کا ایک سوال رسم الخط کا بھی مسئلہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ گاندھی جی کی اس بارے میں رائے کیا تھی؟ ان کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستان کا ہر باشندہ دونوں رسم الخطوں سے واقفیت پیدا کرلے۔ اردو رسم الخط سے بھی اور دیوناگری سے بھی۔ انھوں نے ہندوستانی سبھا اسی غرض سے قائم کی تھی، اور اس کے کارکنوں کے لیے دونوں رسم الخطوں کا جاننا ضروری ٹھہرادیا تھا۔ برسوں سے میری رائے بھی اس بارے میں یہی رہی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اس رسم الخط کے مسئلہ کا بحالتِ موجودہ یہی ایک صحیح حل ہوسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اردو سے ذوق رکھنے والے اشخاص اس کا انتظار نہ کریں کہ ہندی سے ذوق رکھنے والے کیا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ وہ جس بات کو ملک کے لیے ضروری سمجھتے ہیں، اسے بلا تامل خود اختیار کرلیں۔ زندگی کے میدان میں دوسروں کے بڑھنے کا انتظار کیا جاسکتا ہے لیکن علم کے میدان میں نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں خود قدم بڑھانا چاہیے جو دوسروں کا انتظار کرے گا وہ اپنی فضیلت کا موقع کھودے گا۔ اگر دوسرے لوگ صرف ایک ہی رسم الخط سے آشنا ہوں گے تو ہمیں اس پر افسوس نہیں کرنا پڑے گا کہ ہم ایک کی جگہ دو رسم الخطوں کے جاننے والے ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ ہندوستان کا ہر مسلمان اردو اور دیوناگری، دونوں رسم الخطوں کو سیکھ لے، اور اس بارے میں اپنا عملی نمونہ ملک کے سامنے رکھ دے۔ یہ مہاتما جی کا پیغام تھا، اور مجھے یقین ہے کہ مسلمان اس پیغام پر پوری سرگرمی کے ساتھ عمل کریں گے۔

○

اب میں اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے چاہتا ہوں کہ چند الفاظ ان نوجوانوں سے کہوں جنھوں نے آج اپنی طالب علمی کا دور ختم کرلیا ہے اور زندگی کی نئی منزلوں میں قدم رکھنے والے ہیں۔

تم ایک غیر مذہبی جمہوری نظام حکومت کے باشندے ہو، جس نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ملک کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کو غیر مذہبی اور جمہوری طریقہ کے مطابق نشو ونما دے گی۔ ایک غیر مذہبی جمہوری نظام حکومت کا جوہری خاصہ یہ ہے کہ وہ ملک کے تمام افراد کے لیے یکساں طریقہ پر ہر طرح کی ترقیوں کے مواقع پیدا کردیتی ہے۔ اس میں مذہب، نسل، ذات اور فرقہ کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ ایک ایسی حکومت کے باشندے ہونے کی حیثیت سے تم بجا طور پر یہ توقع کرسکتے ہو کہ تمہارے آگے ملکی زندگی کے تمام دروازے کھل جائیں۔ سیاست، انتظام حکومت، تجارت، صنعت وحرفت، مختلف قسم کے پیشے، کوئی دروازہ ایسا نہ ہو، دلاؤں گا کہ آج کوئی دروازہ بھی تم پر بند نہیں ہے۔ ملک کی زندگی کا ہر دروازہ کھلا ہے۔ بشرطیکہ تم قابلیت کی پختگی، محنت کی سرگرمی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیرت کی مضبوطی کے ساتھ قدم بڑھا سکو، .... لیکن اب ضروری ہے کہ قومی آزادی کی فضا تمہارے مطمح نظر کو زیادہ بلند، تمہاری ہمتوں کو زیادہ اولوالعزم، اور تمہارے ولولوں کو زیادہ وسیع کردے۔ تمھیں اب پُرانے ہندوستان کے ذہنی ماحول سے نکلنا ہے اور نئے ہندوستان میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا نیا مصرف ڈھونڈھنا ہے۔ تمہاری بلند پروازیوں کے لیے اب پچھلی بلندیاں پست ہوگئیں، اور تمہاری جولانیوں کے لیے اب پُرانے میدان تنگ ہوگئے۔ تم نے سعی وعمل کے جو پُرانے پیمانے اپنے ہاتھوں میں رکھے تھے، وہ وقت کی نئی پیمائشوں کے لیے کام نہیں دے سکتے۔ تمھیں اب نئے پیمانے ڈھالنے ہیں۔ تمھیں نئے بٹوں سے سعی وعمل کی نئی مقداریں تولنی ہیں۔ تمھیں اب زندگی کی جدوجہد میں نئے ارادوں اور نئی اولوالعزمیوں کے ساتھ قدم اُٹھانا ہے اور اس قابلیت کو جو تم نے اس درس گاہ سے حاصل کی ہے ایسے کاموں میں لگانا ہے جو تمہارے ملک کی نئی رفعت طلبیوں کا ساتھ دے سکیں۔ میرا دماغ اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں رکھتا کہ اگر تم نے وقت کی ترقی پسند قومیت کی روح اپنے اندر پیدا کرلی جو تمہاری غیر مذہبی جمہوری حکومت کا دستور العمل ہے، تو تمہارے وطن کی کوئی بلندی بھی ایسی نہیں ہوگی جہاں تک تمہارا ہاتھ نہ پہنچ سکے اور کوئی کامرانی بھی ایسی نہیں ہوگی جو تمہارا استقبال نہ کرے۔

(مأخذ: علی گڑھ میگزین ۱۹۴۹ء - مقتبس)

***

سرسید نے کہا تھا :

اختلاف مستحب ہے، کارِ ثواب ہے، کبھی کبھی ضروری بھی ہوجاتا ہے، اس لئے پسندیدہ امر ہے؛ **مخالفت** بری چیز ہے، اکثر عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے؛ سوچنے پر، ایمانداری پر چھاپہ ماردیتی ہے۔

سر سید کے بارے میں مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا تھا

مولانا آزاد اپنے رسالہ 'لسان الصدق' میں

۱۹۰۳ء-۱۹۰۵ء

دربارِ سیّدِ اعظم : اس نمبر کے ساتھ ایک دلچسپ گروپ خریدارانِ رسالہ کی خدمت میں نذر کیا جاتا ہے۔ اکبر اعظم کا نورتن دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں ایک خالص امتیاز کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، لیکن مجدّ دانِ اعظم کے دربار میں سرسید اعظم کا نورتن بھی ہمیشہ ممتاز نظروں سے دیکھا جائے گا۔ اکبر اعظم نے اپنے مشیروں کے کمال سے فائدہ اٹھا کر اگر ہندستان کی بڑے بڑے مقامات کو فتح کر لیا تھا، تو سرسید اعظم نے اپنے مشیروں کی ہمدردی سے فائدہ اٹھا کر ہندستانیوں کے سخت دلوں کو فتح کر لیا۔

یہ گروپ ایسی صورت میں حاضر کیا جاتا ہے، جو چوکھٹوں میں لگا کر کمروں کی زینت کا کام دے سکے۔

●

یہ بات کسی کے ماننے نہ ماننے کی نہیں ہے، ملک نے، قوم نے، زمانے نے اور ساتھ ہی گورنمنٹ نے تسلیم کر لیا ہے کہ مسلمانان ہند میں، خواہ وہ شمالی ہند کے ہوں، خواہ جنوبی ہند کے، ممالک متحدہ کے ہوں، خواہ ممالک پنجاب کے، تعلیمی تحریک صرف اس شخص کی کوشش و جانفشانی کا نتیجہ ہے جو آج علی گڑھ کالج کے ایک گوشۂ مسجد میں آرام کر رہا ہے، اسی نے ہم کو اول اول بتلایا کہ ہماری کیا حالت ہے؟ گورنمنٹ سے ہمارا تعلق کس قسم کا ہے؟ ہم کس مرض میں مبتلا ہیں؟ اور اس کا علاج کیا ہے؟ اسی نے ہم کو پہلے اس راستہ پر چلایا، جس پر آج بہت سے چلنے والے نظر آ رہے ہیں۔ اسی نے سب سے پہلے وہ چراغ دکھلایا، جس کی روشنی میں ہم کو اپنی حالت صاف صاف نظر آئی، اور بہتوں نے اس سے اپنے اپنے چراغ روشن کر لیے۔ یعنی آج جس قدر علمی تحریک، علمی ذوق، کانفرنسوں کا وجود، مدارس کا خیال، ملک کے مختلف حصوں میں نظر آ رہا ہے، وہ ایک ہی آدم کی چیخ پکار کا اثر یا ایک ہی کوشش کا ثمر ہے۔ اس لیے درحقیقت وہ شخص سخت محسن کش، احسان فراموش، اور کافرِ نعمت ہے جو اپنے اصل محسن اور حقیقی راہنما کی جانفشانیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔

اب سے چالیس برس پیشتر جبکہ سرسید کی تحریک ملک میں پھیلی نہیں تھی، کیا کسی انجمن، یا تعلیمی کانفرنس کا وجود ہم کو بتلایا جا سکتا ہے؟ یا کسی ایسی عام تحریک کا پتہ دیا جا سکتا ہے، جو آج کل کی تعلیمی تحریکوں کی مماثل ہو؟ اسی علی گڑھ کی خاک پاک سے یہ تحریک عمل میں آئی اور یکا یک تمام ملک میں پھیل گئی، آج بہت سی کانفرنسیں موجود ہیں، بہت سی انجمنیں نظر آتی ہیں، سیکڑوں مدرسے قائم ہو رہے ہیں۔ لیکن کس تحریک کا نتیجہ ہیں؟ اور کس نے یہ خیال قوم میں پیدا کیا؟ کیا کوئی ہے کہ سرسید کے سوا کسی کا نام لے سکے؟!

سرسید کا ہم پر کوئی ذاتی احسان نہیں ہے۔ سرسید نے ہم کو ملک و دولت نہیں دیدی۔ پھر ہم کیوں اس کے فدائی ہو رہے ہیں؟ صرف اس لیے کہ اس کے کام ہم کو مجبور کرتے ہیں کہ اس کی تعریف کریں، اس کی تعریف ہماری ذاتیات میں داخل ہو گئی ہے؛ اور ہماری زبان اس کی ستائش سے بند نہیں ہو سکتی، اگر ایسی ہی تعریف کا مستحق بننا چاہتے ہیں تو خاموشی کے ساتھ کام کرتے جائیں۔ زمانہ خود ایک دن تعریف کا ڈنکا بجا دے گا۔

●

۱۹۲۰ء میں

۱۹۲۰ء میں ملیح آبادی آزاد کے ساتھ جیل میں تھے، اس وقت بھی سید کی محبت و عقیدت میں سرشار تھے۔ لکھتے ہیں:

سرسید کی تصانیف کے مطالعے کی وجہ سے میرے دماغ میں ایک نیا طوفان اُٹھ چکا تھا، اور علما کی جانب سے طبیعت میں سخت بدظنی اور انکار پیدا ہو چکا تھا۔

اس زمانے میں مجھے لکھنے اور ترجمہ کرنے کا بہت شوق ہو گیا تھا کیونکہ طبیعت میں مذہبی بے اطمینانی پیدا ہو چکی تھی، اِس لیے طلب اور جستجو میں طبیعت سرگرم رہتی تھی۔ اسی زمانے میں مَیں نے امام غزالی کی تصانیف دیکھیں۔ سب سے پہلے تو سرسید کے اس ریویو سے، جو انھوں نے امام صاحب کے دس رسالوں پر لکھا ہے، مجھے امام صاحب کی تصانیف کا شوق ہوا تھا...

اردو کی نئی کتابوں کے سلسلے میں سرسید مرحوم کی بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی منگوائی تھیں، مثلاً 'مجموعۂ لکچرز'، اور 'لکچر اسلام پر'، اِس سے اُن کی اور تصنیفات کا شوق ہوا اور اس طرح میری زندگی کے ایک بہت بڑے فکری تغیر کی بنیاد پڑی۔

سب سے پہلے میں نے فضل الدین تاجر کشمیری بازار لاہور سے مجموعہ مضامین تہذیب الاخلاق کی تین جلدیں منگوائیں۔ ان میں ایک جلد سرسید کے مضامین کی، ایک نواب محسن الملک کی۔ ایک مولوی چراغ علی کی، اور ایک مجموعہ ہے۔ اسکے بعد تفسیر القرآن کی پہلی جلد، جو پنجاب میں چھپی تھی، وہ منگوائی اور پھر براہ راست ڈیوٹی شاپ علی گڑھ سے سرسید کی کتابیں منگوانے لگا اور رفتہ رفتہ میں نے تمام تصنیفات منگوا لیں۔ سرسید کی تصنیفات کا شوق بتدریج اس طرح دل و دماغ پر چھا گیا کہ اب کوئی تصنیف ان کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی تھی۔ شوق نے ارادت و عقیدت کی شکل اختیار کر لی، اور یہ ہوا کہ ایک **عقیدتمند** کی طرح، جو اپنے **شیخ و مُرشد** کی ملفوظات کے ایک ایک لفظ کو دل و جان دے کر خریدنا چاہے، انکی تصنیفات کا ہر ورق و صفحہ مَیں نے نہایت جدوجہد کر کے حاصل کیا۔

سرسید کی تصنیفات سے مجھے ٹائپ کے چھاپے سے ایک ذوق پیدا ہو گیا، اور چونکہ سرسید کی کتابیں پہلے ٹائپ میں چھپی ہیں، اور بعض بعض پھر لیتھو میں بھی نقل ہو گئیں اسلیے میری کوشش یہ رہی کہ ہر کتاب کا ٹائپ ہی کا ایڈیشن حاصل کروں۔ تفسیر اور مجموعہ تصنیفات احمدیہ کے علاوہ، جن میں تبیین الکلام! اور خطبات احمدیہ ہیں، میں نے تہذیب الاخلاق کی تینوں اشاعتوں کی مکمل فائلیں بھی منگوائیں پہلی اشاعت سات سال تک رہی ہے اُس کی بعض جلدیں، ڈیوٹی شاپ میں نہیں تھیں مَیں نے کوشش کر کے اور فی جلد پچیس روپیہ قیمت دیکر اسی کے توسط سے حاصل کیں پھر خیال ہوا کہ ان کے بہت سے مضامین؛ علی گڑھ گزٹ اور سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار میں بھی، جو ان کے سفر یورپ کے بعد تک جاری رہا، نکلے ہوں گے، نہایت گراں قیمت دیکر ان کی فائلیں بھی حاصل کیں اور سرسید کے انتقال تک علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی جتنی فائلیں مِل سکیں، وہ بھی منگوائیں۔ مقصود یہ ہے کہ سرسید کی تصنیفات سے شوق نہیں بلکہ عشق ہو گیا تھا اور طبیعت کو اس تصور سے بھی صدمہ ہوتا تھا کہ ان کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ ہے اور میرے پاس نہیں ہے!...

رحمت اللہ رعد کی جنتری میں غالباً ۱۹۰۰ء کی جنتری میں حیاتِ جاوید کی طباعت کے قریب الاختتام ہونے کا ذکر چھپا تھا۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کتاب کی اشاعت کا کیسا سخت اور جانکاہ انتظار مجھ میں پیدا ہو گیا تھا۔ کم سے کم دو تین جوابی کارڈ ہر مہینے نامی پریس کانپور کو لکھتا تھا کہ کسقدر حصّہ باقی ہے۔

ڈیوٹی شاپ کو میں نے پیشتر سے خط لکھ دیا تھا کہ بمجرد اشاعت میرے نام وی پی بھیجدیں۔ پھر کھٹکا ہوا کہ کہیں تاجرانہ اصول پر احتیاطاً منظوری کی تجدید نہ کرنا چاہیں اسطرح ایک ہفتے کی اور دیر ہو جائیگی پھر انھیں ایک خط لکھا اور اس میں صراحت کر دی کہ بلا کسی اطلاع کے وی پی بھیجدیں، لیکن بایں ہمہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے منیجر کو بھی میرا شوق دیکھ کر ستم ظریفی سوجھی تھی ایک دن ایک کارڈ ملا کہ حیاتِ جاوید چھپ کر تینوں قسم کی آ گئی ہے۔ آپ کی درخواست درج رجسٹر ہے۔ اگر مطلوب ہو، تو بھیج دی جائے!

میں اس غم و غصّہ کو کیونکر بیان کروں، جو اُس دن مجھ پر طاری ہوا۔ اگر کوئی ذریعہ بھی ایسا ہوتا کہ چھ دن کی تاخیر کی جگہ ایک دن کے اندر علی گڑھ سے کتاب مجھے پہنچا دی جاتی۔ تو میں اپنے تئیں بیچ کر بھی اسے حاصل کرتا۔ اور تو کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی یہ سمجھ کر کہ کم از کم تین دن کی تخفیف ہو جائے "تار" لکھوایا اور بھیج دیا۔ آخر چار دن کے بعد پارسل آیا۔ پیون تک کی صورت، اس کے کاندھے کا بوجھل تھیلا، اس کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے پارسل، اس زمانے میں میری آنکھوں کے لیے دنیا کا سب سے زیادہ حسین منظر تھا جس کے انتظار میں کوئی روح بے چین رہ سکتی ہے، اور جس کی آمد پر کوئی آنکھ استقبال کر سکتی ہے!

میں اب بھی اس عالم کو یاد کرتا ہوں۔ کلکتے میں چٹھی رسالوں کا یونی فارم خاکی رنگ کا ہوتا ہے، سر پر بھی خاکی پگڑی ہوتی ہے۔ یہ مجھے خواب میں بھی نظر آتا اور اس پوشش میں کچھ عجب کشش میرے لیے پیدا ہو گئی تھی۔ عموماً پوسٹ صبح کو ملتا، جس میں پارسل کی روانگی کی اطلاع ہوتی تھی۔ پارسل یا تو اُسی دن دوپہر کو آتا، یا دوسرے دن۔ معاملے کی یہ توسیع میرے لیے بڑی ہی باعث کشاکش ہو گئی تھی۔ جی چاہتا کہ آج ہی آئے۔ دوپہر کے وقت میں اپنا مطالعہ لیکر نیچے کے کمرے میں یا باہر کے ایک تخت پر، جو بچھا رہتا تھا، بیٹھا کرتا، محض اس انتظار میں کہ پیون کے آنے پر بلا ایک لمحہ کی تاخیر کے میں اُس کا استقبال کر سکوں!

خوش قسمتی سے حیاتِ جاوید کے لیے دوسرے دن کا انتظار نہ کرنا پڑا۔ پارسل جب ہاتھ میں آیا تو وہ وقفہ جو اُس کی بندش کے کھولنے میں لگا، اور وہ لمحہ مضطرب جو اُسکی لوح کے دیکھنے کے وقت

طاری ہوا، مجھے اب تک نہ صرف یاد ہے بلکہ محسوس ہو رہا ہے۔ میں نے اُسے رُپیہ بھی نہیں دیا اور پارسل لے کر اوپر بھاگا۔ حیاتِ جاوید ایک ہزار صفحے میں ختم ہوئی ہے میں نے دو شب میں ختم کر ڈالی تھی۔ یہ بھی مجھے یاد ہے کہ اپنے اس معمول کے مطابق کہ کسی نئی کتاب کے حصول پر کم سے کم ایک وقت کا کھانا ضرور فراموش ہو جاتا تھا، اُس دن بھی میں نے شام کا کھانا نہیں کھایا۔ اس خوف سے کہ اتنی دیر تک مطالعے سے محروم رہ جاؤں گا۔ حیاتِ جاوید تین قسم کی چھپی تھی۔ درجۂ اوّل مجلد بارہ رُپیہ تھا۔ میرے پاس درجۂ دوم کا نسخہ تھا کمال شوق میں درجۂ اول بھی منگایا۔ یہ ۱۹۰۱ء کی بات ہے۔

سرسید کی تصنیفات کے مطالعے نے علومِ جدیدہ سے نہ صرف آشنا بلکہ شائق و گرویدہ بنا دیا تھا۔ اب وہ دن تھے کہ عقائد و افکار میں ایک طوفان اٹھ چکا تھا۔ میری زندگی اب چل نہیں رہی تھی، بہہ رہی تھی۔ تمام قدیم چیزیں حقیر و ذلیل ہو چکی تھیں۔ علومِ جدیدہ اور یہ ترکیب سرسید مرحوم ہی کی ہے، اور ہر وہ چیز جو انکی طرف منسوب ہو، میرے قلب و ذہن کے لیے بمنزلۂ معبود کے تھی۔

"لسان الصدق" کا زمانہ، سرسید مرحوم کی تقلید و اتباع کی سرمستی کا زمانہ تھا۔ طبیعت میں انکی عقیدت، پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی آواز، جس میں ایک شائبۂ اختلاف یا تنقیص ہو طبیعت کو گوارا نہ تھی۔ سرسید مرحوم کے ساتھ ان کا حلقہ، یا اُس وقت میری اصطلاح کے بموجب 'نورتن' بھی اُسی درجہ محترم تھا جس قدر سرسیّد۔

یہ زمانہ تھا اور ذہن و دماغ اس عالم میں کہ اچانک ایک نئی راہ سامنے آئی۔ میرا اشارہ سرسید کے مصنّفات کی طرف ہے۔ چونکہ اس واقعہ نے میرے عقائد و افکار کی زندگی پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے...

طبیعت قدرتی طور پر پوری طرح کسی نئی حالت کے لیے تیار و منتظر تھی۔ سرسید کی تصنیفات جب نظر سے گزریں، تو بالکل ایک نئی دنیا نظر کے سامنے آگئی۔ طبیعت چونکہ موجودہ سابقہ حالات سے بالکل متوحش ہو چکی تھی اور ماحول میں کوئی غالب موثر موجود نہ تھا، اس لیے قدرتی طور پر اس نئے عالم کی دلفریبیوں نے مسحور کر لیا۔ جوں جوں بڑھتا گیا، مسحوریت بھی بڑھتی گئی حتیٰ کہ اب ایک مسمریزم کے معمول کی طرح میری دماغی فعّالیت بالکل عامل کے قبضے میں تھی۔ تقریباً چھ مہینے کے اندر میں نے سرسید کی تمام کتابیں دیکھ ڈالیں، اور اچانک ایسا معلوم ہوا کہ ایک بے حد عجیب مدہش اور بلند تر پُرعظمت عالم میں آ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بالکل ایک مخمور دماغ کی سی حالت رہنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب و غریب خزانہ قبضے میں آ گیا ہے۔ اس پر فخر تھا، غرور تھا، اور اسکے سامنے فکر و عقائد کی تمام پچھلی باتیں ہیچ نظر آتی تھیں۔ میں نے "ہیچ" کہا، لیکن یہ بھی ابتدائی احساس تھا۔ بعد کو یوں ہوا کہ حقارت کی جگہ اُن کی ذلت کا احساس ہونے لگا۔ اس خیال سے شرم محسوس ہوتی تھی کہ چھ مہینے پہلے میرے ایسے عقائد تھے، اور تعجب ہوتا تھا کہ کیوں ایسے دقائق سے اب تک محروم رہا! اب معاملۂ تقلید و عدمِ تقلید، وہابیت و حنفیت سے گزر چکا تھا، اور ایک ایسی بلندی پر اپنی جگہ محسوس ہوتی تھی جہاں سے یہ تمام جماعتیں، یہ تمام عقائد و افکار، اور یہ تمام جھگڑے بالکل حقیر دکھائی دیتے تھے، خواہ حنفی ہوں، خواہ غیر مقلد، شیعہ ہوں یا سنی، ماتُریدی ہوں یا اشعری، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی اسلام کی اصلی حقیقت، یا سرسید کی اصطلاح میں "ٹھیٹ" اسلام سے آشنا نہیں۔ قرآن کے اصلی حقائق و معارف اور مذہب کی اصلی تعلیمات تو وہ ہیں جن کے چہرے پر سے تیرہ سو برس بعد اس مجدّدِ اعظم (جیسا کہ میری اُس وقت کی بول چال تھی، یعنی سرسیّد) نے پردہ ہٹایا ہے!

میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ اُس زمانے کی دماغی سرشاری اور قلبی مخموری کی پوری تصویر کھینچ سکوں۔ میں ایک بُت کی طرح سرسیّد کی پوجا کرتا تھا۔ اُن کی عظمت میرے دل کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی۔ ان کا وجود میرے ذہن میں فضائل انسانی کا ایک مکمل نمونہ تھا، جسکی طرف ایک شائبۂ نقص بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا! بارہا حسرت ہوتی تھی کہ "یالیتنی کنت معہ!" (اے کاش میں ان کے ساتھ ہوتا!) میں سوچتا کہ اگر وہ اس وقت موجود ہوتے، تو میں کس طرح تمام علائق ترک کر کے اُن کے پاس چلا جاتا، اور کس طرح اُن کی پرستش کرتا!

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انسان 'تقلید' سے کبھی باز نہیں آتا۔ ترکِ تقلید ہی کے نام پر وہ جن شخصوں کی عزت کرتا ہے، اُنہی کی تقلید شروع کر دیتا ہے۔ میں نے سرسیّد سے سب سے بڑی چیز جو اُس وقت پائی تھی وہ یہی ترکِ تقلید تھی۔ مفسرین کی، فقہاء کی، محدثین کی، متکلمین کی، تمام علما کی، تیرہ سو برس کے تمام اجماعی عقائد و مسلّمات کی اور اُن کروڑوں اور اَن گنت مسلمانوں کی جو تیرہ صدیوں میں گزر چکے۔ تاہم میں خود سرسیّد کا نہ صرف مقلدِ اعمیٰ تھا، بلکہ تقلید کے نام سے پرستش کرتا تھا!

(عبدالرزاق ملیح آبادی: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی)

***

جدید اردو کے سب سے بڑے شاعر احمد ندیم قاسمی اور خورشید الاسلام!

یہ دو سب سے بڑے شاعر ہیں، خورشید الاسلام اور احمد ندیم قاسمی۔
مگر بات علی گڑھ کی چل رہی ہے اس لئے خورشید الاسلام کی بات ہوگی۔ احمد ندیم قاسمی پھر کبھی۔

اردو نے بیسویں صدی کے آخری دہائی سے لے کر اکیسویں صدی کے اولین دہائی تک دو بڑے سوچنے والے، مگر اعلیٰ درجے کی شاعری کرنے والے، دو بڑے دانشور پیدا کیے، ایک سرحد پار (احمد ندیم قاسمی) اور دوسرا علی گڑھ میں (خورشید الاسلام) وہ اقبال نے کیا کہا ہے کہ ''اپنے جوہر سے رہا بیگانہ تو''۔ وہی ہمارا حال رہا!

کرکٹ میں تو موازنہ ہوتا رہتا ہے کہ ہم بڑھ گئے یا وہ، ہم آگے نکل گئے یا وہ۔ کھیل تو کھیل ہے، اسی اسپرٹ میں لینا چاہیے، مگر دونوں کی بدقسمتی کہ شاد عارفی کا مصرع بیچ میں آجاتا ہے :
ع ڈاڑھی ٹوپی نے الجھادی : کبھی کبھی تو بڑی تلخی کی نوبت آجاتی ہے۔

خیال آیا ایک ہی زمانے میں، ایک طویل ہمعصری رہی، دونوں دانشورانہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ جانے اور مانے جاتے تھے، ایک علی گڑھ میں تھا اور دوسرا لاہور میں۔ ایک سرحد پار کا سب سے بڑا شاعر تھا؛ دوسرا، علی گڑھ میں ہمارا سب سے بڑا شاعر، دانشوری کی آبرو!

علی گڑھ پیدا تو بڑے لوگ کر دیتا ہے، مگر بڑے کی پہچان نہیں ہو پاتی۔ خورشید الاسلام کو تو رالف رسل نے پہچان لیا، علی گڑھ والوں نے دیر کر دی۔

تو، آیئے، کچھ دیر **خورشید اسلام** کے ساتھ:

دیکھا انھیں قریب سے ہم نے، تو رو دیئے ...... جن بستیوں کو آگ لگانے چلے تھے ہم
کچھ تو ہو جس کے فیض سے دل کو ہو تاب و تب بہم ...... کوئی خیال، کوئی خواب، کوئی خدا، کوئی صنم
ذوق یقیں کی، حسنِ مروت کی، غم کی موت ...... جو کچھ دکھائے عمرِ رواں، دیکھتے چلیں
آدمی زندگی پہ مرتا ہے ...... زندگی آدمی کو ڈستی ہے
کسی غریب سے کہتے تو کیا، یہ شرم آئی ...... کہ اپنے ہاتھ میں دنیا کا انتظام نہیں
سانس لیتے ہیں تو رونے کی صدا آتی ہے ...... ایک ہنگامہ سا رہتا تھا مکاں میں پہلے
یہ اہلِ شب ہیں، اٹھو، ان کی انجمن سے چلیں ...... کہ ذکرِ منزلِ گور و کفن بہت ہے یہاں
خفا ہوئی جو کسی موڑ پر کسی سے تو پھر ...... کسی کو مڑ کے بھلا زندگی نے کب دیکھا
اب جو جاگے ہیں تو ہے مے سے سبو چہ خالی ...... عمر بھر نشہ میں سو سو کے یہ ہم بیٹھے ہیں
کاش یوں ہوتا کہ دنیا میں اکیلے ہوتے ...... بوجھ کس کس کا یہاں ڈھوکے، یہ ہم بیٹھے ہیں

اب ذکر **احمد ندیم قاسمی** کا بھی آ ہی گیا ہے تو ان کے چند شعر بھی سن لیجیے:

سر بچا لائے ہو لیکن یہ زیاں تو دیکھو ...... کتنا ویران ہے، تا حد نظر منظرِ دار
انسان عظیم ہے خدایا ...... جس نے تیرا آسماں بنایا
کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا ...... میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
کچھ کھیل نہیں ہے عشق ہے یہ ...... یہ زندگی بھر کا رتجگا ہے
جس بھی فنکار کا شہکار ہو تم ...... اس نے برسوں تمہیں سوچا ہوگا

***

سید حامد

از پروفیسر محمد اقبال (شعبۂ علم نباتات، جامعہ ہمدرد، تغلق آباد، نئی دہلی)

محترم سید حامد صاحب کے بارے میں کچھ کہنا یا لکھنا کوئی آسان کام نہیں' یہ اپنے دور کی ایک ایسی ہشت پہلو شخصیت رہی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں موصوف نے اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور کھیل کے دوران کبھی کسی کو اپنے پتّے نہیں دکھائے۔ انکی قوت ضبط لامحدود' انکی وضعداری بے مثال اور انکی نیک نیتی بسا اوقات شکوک وشبہات سے بالاتر رہی' تاہم انکے طرز عمل اور حسن ادراک نے جا بجا غیر مطلوب بکھیڑے بھی کھڑے کیے۔ ملّی بیداری کی مہم میں انکی خدمات کی فہرست طویل ہے۔ شمالی ہند کی زبوں حال ملّت اسلامیہ کا بچا کھچا اثاثہ ماضئ قریب میں جن گِنی چُنی شخصیات پر مشتمل رہا ہے' ان میں سیّد صاحب کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ راقم موصوف کا اندھا شیدائی کبھی نہیں رہا' گرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جانے انجانے انکی ذات سے احقر کو گاہے گاہے فیض پہونچا' مثلاً پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری' مسلم یونیورسٹی میں لیکچرر شپ اور جامعہ ہمدرد کی وائس چانسلری مجھے حامد صاحب کی جنبش قلم سے ہی حاصل ہوئیں۔

سید حامد نے ۲۸ مارچ ۱۹۲۰ کو اتر پردیش کے فیض آباد ضلع میں آنکھیں کھولیں اور ۱۹۳۵ میں امتیازی نمبروں سے ہائی اسکول پاس کرکے ایشان چندر میڈل حاصل کیا۔ انہوں نے ۱۹۴۱ میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا اور کچھ برسوں بعد (۱۹۴۷ میں) فارسی میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۳ میں انہوں نے اتر پردیش کے سِوِل سروس امتحان میں دوسری پوزیشن حاصل کرکے ملازمت کا آغاز کیا اور ۱۹۵۱ میں انڈین ایڈمنسٹریٹو سروِس (IAS) میں منتخب ہوگئے۔ دوران ملازمت وہ امور داخلہ' کامرس اور مواصلات کی وزارتوں سے وابستہ رہے اور ملک کے چوتھے پانچ سالہ منصوبے کی تیاری میں کلیدی رول ادا کیا۔ انہوں نے اسٹاف سلیکشن کمیشن کی بنیاد ڈالی اور اسکی سربراہی کی۔ ۱۹۸۰ میں وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنا کر بھیجے گئے۔ انہی کے دور اقتدار میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ (۱۹۸۱) کا نفاذ ہوا اور برسہا برس سے سلب کی گئی یونیورسٹی کی خودمختاری بحال کی گئی۔ ۱۹۸۲ میں حامد صاحب نے سر سیّدؒ کی سرپرستی میں شروع ہونیوالے ماہنامہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت کے بھولے بسرے مشن میں دوبارہ روح پھونکی اور تب سے یہ ماہنامہ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۵ میں وہ دلّی کی ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی سے وابستہ ہوگئے اور یہ تعلق آخری سانس تک قایم رہا۔ معتمد اعزازی کی حیثیت سے وہ سوسائٹی کے تحت چلنے والے ہمدرد پبلک اسکول اور رابعہ گرلز پبلک اسکول کے سرپرست تھے' انہی کی سرپرستی میں ہمدرد اسٹڈی سرکل نے اقلیتی فرقوں کے ہونہار نوجوانوں کو سِوِل سروِس امتحانات کے لیے معیاری کوچنگ مفت فراہم کرنے کی خدمت کا آغاز کیا۔ اس ادارے کے توسّط سے ابتک تقریباً چارسو طلبا ملک کے انتظامی ڈھانچے کا اہم حصہ بن چکے ہیں۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی ملک بھر کے ہونہار مسلم طلباء میں سے چنیدہ امیدواروں کے لیے وظائف کا اہتمام بھی کرتی ہے۔ زندگی بھر کمر سیدھی اور شانے بلند رکھنے والے اس فعّال مہاپُرش کو آخری ایّام میں وقت نے مات دیدی۔ کئی برس تک آنتوں کی بیماری سے نبرد آزمائی کے بعد بہر کیف بستر سے یارانہ کرنا ہی پڑا۔ یہ رفاقت تقریباً سال بھر قایم رہی اور آخرکار ۹۵ برس سے کچھ کم کی عمر میں ۲۹ دسمبر ۲۰۱۴ کو سیّد صاحب نے اس جہان رنگ وبو سے منہ موڑ لیا۔

تعلیم' ادب اور ملّی خدمات سے متعلق مصروفیات حامد صاحب کے شب وروز پر زندگی بھر حاوی رہیں۔ بنارس میں انہوں نے سر سیّد ایجوکیشن سوسائٹی قایم کی جو آج کئی تعلیمی اداروں کی سرپرستی کر رہی ہے۔ مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے قیام میں حامد صاحب کا نمایاں تعاون رہا اور بعد میں وہ اسکے نائب صدر بھی منتخب کیے گئے۔ اتّر پردیش میں اقلیتوں کے زیر انتظام چلنے والے اسکولوں اور کالجوں کی انجمن کے بھی وہ صدر رہے۔ وزیر اعظم کے پندرہ نکاتی پروگرام اور نئی تعلیمی پالیسی (۸۶ء) پر عملدرآمد کا جائزہ لینے کے لیے وزارت فروغ انسانی وسائل کی قایم کردہ کمیٹی کے سربراہ رہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی بھی صدارت فرمائی۔ مسلمانان ہند میں تعلیمی بیداری کے لیے یوپی رابطہ کمیٹی قایم کی اور ۱۹۹۲ میں پہلے تعلیمی کارواں کی قیادت فرمائی' جسکے بعد بہت سے کارواں ملک کے طول وعرض میں مصروف عمل رہے۔ اسلامک ڈیولپمنٹ بینک کی وظیفہ کمیٹی کے رکن رہے اور پھر اس بینک کے دو ذیلی اداروں (مسلم ایجوکیشن ٹرسٹ اور مسلم ایجوکیشن کمیٹی) کے صدر منتخب ہوئے۔ مختلف اوقات میں حامد صاحب علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کورٹ' دلّی یونیورسٹی کورٹ' مرکزی وقف بورڈ' کل ہند فورم برائے جمہوریت وفرقہ وارانہ ارتباط' گاندھی سمرتی' ذاکر حسین کالج ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے معمّر اشخاص جیسے متعدد اداروں کے ممبر رہے' وہ ۱۹۹۹ میں قایم شدہ ادارے 'تحریک برائے استحکام مسلمانان ہند' کے پہلے صدر منتخب ہوئے' اور بین الاقوامی مفاہمت کے لیے دیئے جانے والے باوقار جواہرلال نہرو ایوارڈ کی اعلیٰ اختیاری جیوری کے بھی رکن رہے [۱]۔

ایّام نوجوانی میں وہ ہاکی کے ایک اچھے کھلاڑی تھے، ملک میں ہاکی کو فروغ دینے والی بنیادی تنظیم 'جواہرلال نہرو ہاکی ٹورنامنٹ سوسائٹی' کے نائب صدر بھی منتخب کیے گئے اور اس حیثیت سے ملک گیر پیمانے پر ہاکی کے کھیل کو منظّم کرنے میں

سید حامد بہ قلم خود

۶۲-۶۳ برس ہوئے اتر پردیش کے شہر بَرن میں، جسے اب بلندشہر کہتے ہیں، ایک نوخیز ڈپٹی کلکٹر تعینات ہوا۔ اسے برطانوی راج کی خدمت میں داخل ہوئے مشکل سے ڈیڑھ برس گزرے ہوں گے۔ کلکٹر اس ضلع کے اس وقت تاریخِ ادب اردو کے مصنف ڈاکٹر رام بابو سکسینہ تھے۔ ان سے ہمارے نوخیز افسر کی مڈبھیڑ بجنور میں ہوئی تھی جہاں اس نے وہاں کے کلکٹر خان بہادر سید احمد علی کے ایما پر ایک مشاعرہ اور ایک ادبی کانفرنس برپا کی۔ مشاعرہ کے صدر 'اعمال نامہ' والے سر رضا علی تھے۔ ادبی کانفرنس کی صدارت کا قرعہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے نام کھلا تھا۔ معلوم نہیں انھیں میری کون سی ادا بھا گئی کہ بجنور سے واپسی پر انھوں نے چیف سکریٹری سے کہہ کر مجھے بلندشہر کھینچ بلایا۔ موصوف بڑی آن بان رکھتے تھے۔ کایستھ تھے اس لیے اردو پر عبور حاصل تھا، لیکن صرف زبانی اردو پر۔ تحریر پر ان کا بس نہیں چلتا تھا۔ تاریخِ ادب اردو انھوں نے انگریزی میں لکھی تھی۔ نمائش میں دربار لگتا تھا، بڑے تزک واحتشام کے ساتھ۔ دربار کے لیے تقریر لکھنے کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ اس کے علاوہ شام کو ان سے ٹینس کورٹ میں روز ملاقات ہوتی۔ بھاری بدن کے باوجود وہ ٹینس کھیلتے تھے۔ اپنے نوعمر چھریرے بدن والے ڈپٹی کلکٹر سے بہتر۔ لیکن کھیلوں کی دنیا میں اس کو ایک برتری میسر تھی۔ اس نے ہاکی میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ علی گڑھ سے نشانِ امتیاز یا کلر لے کر آیا تھا۔ اس کی شامیں ٹینس اور ہاکی کے درمیان بٹ جاتی تھیں۔ بجنور کی طرح یہاں بھی اس نے کچہری کے اہل کاروں کو جوڑ کر ٹیم بنالی تھی۔ جس سے ڈی اے وی کالج بلندشہر اور جاٹ کالج لکھاوٹی کی ٹیموں کے چھکے چھڑا دیئے۔ بجنور میں نووارد ڈپٹی کو، جسے کچہری بچہ ڈپٹی کہتی تھی، اپنے درمیان ہاکی اور گیند سے نقاشی کرتے ہوئے دیکھ کر ٹیم کا حوصلہ بڑھ گیا۔ انگریزوں کا چل چلاؤ تھا، اب نوعمر برٹش آفیسر دیکھنے کو نہیں ملتے تھے۔ لہذا؛ وہ سلسلہ کہ ایس پی اور کلکٹر ٹیموں کی کپتانی کریں، متروک ہو چکا تھا۔ میں نے کھیل کے میدان میں قدم رکھا تو ایک ہلچل برپا ہوگئی۔ کچہری کی ٹیم کے حوصلہ نے آسمان چھولیا۔ حوصلہ کے آگے رکاوٹیں کہاں ٹھہر پاتی ہیں۔ ہماری ٹیم گویا اشومیدھ یگیہ پر نکلی تھی۔ جس کی ہمت ہو راہ میں روک لے۔ کھیل خواہ ہاکی ہو، خواہ ٹینس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چلتا تھا۔ مغرب سے عشاء تک کا وقت پھر بھی بچ جاتا تھا۔ اپنا شمار میں نے (نہ دنیا نے) ملنساروں میں کبھی نہیں کیا۔ لیکن بلندشہر کلب (جہاں میں رہتا تھا) کے پاس سول لائن میں دو گھر ایسے تھے جہاں میں بار پاتا تھا اور جہاں جانے کو جی چاہتا تھا۔ ایک تو خواجہ سعیدالدین صاحب ڈپٹی کلکٹر، ایس ڈی او صدر کا مکان، دوسرے سعیدالدین حیدر صاحب انجینئر ہائڈل کا مکان۔ خواجہ صاحب ایک فرشتہ سیرت انسان تھے جن کا ذکر زمانہ نے فرصت دی تو کبھی تفصیل کے ساتھ کروں گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ سید والا گھر کے

معاون بنے[۲]۔

سیّد صاحب کا ذکر خیر راقم نے پہلی بار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ علم نباتات کے پروفیسر، جناب محمد محمود الرحمان خان آفریدی کی زبانی اس ضمن میں سنا تھا کہ موصوف سول سروسز کے امتحانات میں شریک ہونے والے مسلم طلباء کے لئے دلّی میں مفت کوچنگ وغیرہ کا اہتمام کرایا کرتے تھے۔ ۱۹۷۴ء کی بات ہے، میرے ایک دوست (ڈاکٹر شبیر اشرف جو آج کل مسلم یونیورسٹی میں فیکلٹی آف ایگری کلچر سے وابستہ ہیں) سِول سروِسز امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں دلی گئے ہوئے تھے۔ دریا گنج میں 'بچّوں کا گھر' نامی عمارت میں ان کی کوچنگ اور رہائش کا انتظام تھا۔ وہیں پر میں نے پہلی بار اس خوب رُو، کم گو مگر خوش کلام شخص کو دیکھا جو سیّد حامد کے نام سے موسوم تھا اور وہاں پر مقیم طلبا کی تواضع کے لیے آموں کی پیٹیاں لے کر آیا تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن چند برسوں کے بعد اسی شخصیت کو بارہا مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد میں دست بدعا دیکھنے کا موقع ملا۔ جب سیّد صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی' میں اُن دنوں وہاں پر علم نباتات کا ریسرچ اسکالر تھا۔ اور سید صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے یونیورسٹی کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔

۱۹۸۰ میں جب حامد صاحب نے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا عہدہ قبول کیا تو ایک لایق فرزند کی حیثیت سے مادر درسگاہ کے تئیں ان کی عقیدت کا کیمپس میں بڑا اچرچا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ موصوف عمل جرّاحی کا عزم لے کر علی گڑھ تشریف لائے ہیں اور مادر درسگاہ کے اعضائے رئیسہ کو مدّت مدید سے جمع شدہ غلیظ مادوں سے پاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ سب سن کر اچھا لگتا تھا' عجب اتفاق کہ سیّد صاحب نے پہلا شبخون ریسرچ پروگرام کے سینیر طلبا (پوسٹ ڈاکٹورل فیلوز) پر ہی مارا اور فیصلہ صادر کیا کہ یہ لوگ اقامت گاہوں میں رہائش کے مجاز نہیں ہیں۔ ان دنوں راقم بھی اُسی زمرے میں آتا تھا۔ مضروبین کا ایک وفد موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا جسمیں راقم بھی شامل تھا۔ سیّد صاحب سے ہم کلامی کا یہ ہمارا پہلا موقع تھا۔ عرض وتعریض کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوا کہ شیخ الجامعہ محض اپنی کہنے میں یقین رکھتے ہیں، دوسروں کی سننے میں نہیں۔ ہوا یوں کہ موصوف نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور گردن جھکالی' ہم لوگوں نے اپنا موقف انکے سامنے رکھا مگر ہماری کسی بھی دلیل یا درخواست پر ان کا کوئی بھی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی دستی گھڑی ہمارے سامنے رکھ دی جو اشارہ تھا اس بات کا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ جب اس پر بھی ہماری آہ وبکا کا سلسلہ جاری رہا تو موصوف کھڑے ہو گئے اور مجبوراً سبھی کو کھڑا ہونا پڑا۔ چلتے چلتے ایک بار پھر انہوں نے یاد دہانی کرادی کہ" متبادل رہائش کا انتظام کر لیجیے، ہوسٹل تو بہر حال چھوڑنا ہی ہوگا"۔

یہ ناکام ملاقات ایک طرح سے حامد انتظامیہ اور طلبائے یونیورسٹی کے مابین بدگمانی کا نقطۂ آغاز بن گئی۔ طلبا برادری نے موصوف کے اس پہلے ہی فیصلے کو سخت ناپسند کیا کیونکہ یہ ملک بھر کی تمام جامعات میں رواروایت کے خلاف تھا۔ کئی مرکزی جامعات مثلاً دلّی کی جواہرلال نہرو یونیورسٹی میں تو اس زمرے کے محققین کو نہ صرف اقامتی مراعات دستیاب تھیں بلکہ ان کو خصوصی طور پر فیملی کوارٹرز فراہم کیے جاتے تھے۔ بہر حال اب ہماری عافیت محض اسی صورت میں ممکن تھی کہ شیخ الجامعہ کو کچھ دوسرے معاملات میں الجھا دیا جائے تا کہ مذکورہ مسئلے پر توجہ دینے کا انہیں موقع ہی نہ مل سکے۔ اتفاق سے ہماری یہ مشکل آسان کردی پروفیسر عرفان حبیب صاحب کے ایک اخباری بیان نے، جس سے یونیورسٹی برادری میں شدید ناراضگی پیدا ہوچکی تھی۔ بعد میں عرفان صاحب کے ساتھ دست درازی کا بھی ایک واقعہ پیش آگیا جو نقطۂ آغاز بنا اس پرآشوب دَور کا جسے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کے 'دوسرے تاریک دور' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حد درجہ شورش اور احتجاجی ماحول کے دوران یونیورسٹی کیمپس میں پہلی بار کسی طالب علم نے پولس فائرنگ سے شہادت پائی۔ شیخ الجامعہ کو لمبے عرصے کے لیے پردہ نشینی اختیار کرنا پڑی، پولس اور بارڈر سکیورٹی فورس کے زیرسایہ پورے پانچ برس رسّہ کشی اور پنجہ آزمائی کا دَور دَورہ رہا اور انجام کار ایک مخلص اور لایق منتظم کا پورا عرصۂ کار محض زندہ باد، مردہ باد، کی نذر ہو کر رہ گیا۔ حامد صاحب کے علی گڑھ چھوڑنے پر طلباء نے ایسے طمطراق سے "یوم نجات" منایا جسکی نظیر یونیورسٹی کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ حامد صاحب کے حواریوں پر یہ وقت بہت بھاری پڑا تھا۔ کئی اساتذہ کو لمبی چھٹّی لے کر روپوش ہو جانے میں ہی عافیت نظر آئی تھی۔[۲]

اُن دنوں بحیثیت وائس چانسلر حامد صاحب ایک بار باٹنی ڈپارٹمنٹ تشریف لائے اور اساتذہ کو خطاب کیا۔ اسوقت تک احقر بھی اساتذہ کی صف میں شامل ہو چکا تھا۔ وہیں میں نے پہلی بار انکی انگریزی تقریر سنی۔ کئی الفاظ ایسے سامنے آئے جن کے مطالب و معانی ڈکشنری دیکھنے پر ہی واضح ہو سکے اور تبھی یہ اندازہ بھی ہوسکا کہ موصوف نے ان الفاظ کا کتنا برمحل استعمال کیا تھا۔ ہوسٹل میں قیام کے دوران کئی مرتبہ 'شیخ الجامعہ کے خطوط طلباء کے نام' پڑھنے کا موقع ملا۔ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ بھی بڑے معیاری ہوتے تھے۔ موصوف کے چھوٹے چھوٹے جملوں میں وہ اثر موجود تھا جو دوسروں کی لمبی چوڑی اور فصیح و بلیغ تحریروں میں بھی مفقود تھا۔

علی گڑھ میں حامد صاحب سے احقر کا کبھی کوئی رابطہ قائم نہیں ہوا حالانکہ کئی بار اس کی ضرورت بھی درپیش تھی۔ ۱۹۸۲ میں شعبۂ علم نباتات میں لیکچرر کی حیثیت سے احقر کا تقرّر ہوا تو' خلاف معمول' ایک سال کا پروبیشن پیریڈ بعافیت پورا ہو جانے کے بعد بھی ملازمت کے مستقل ہو جانے کا اعلان نہ ہو سکا۔ یونیورسٹی ضابطوں کے مطابق کسی نو منتخب استاد کی کارکردگی پر صدر شعبہ کی جانب سے اظہار اطمینان کے بعد ہی اس ضمن میں کارروائی کی جاتی تھی' لیکن اگر دو برس کا عرصۂ ملازمت کسی وارننگ اور سرزنش کے بغیر گزر جائے تو صدر شعبہ کے سفارشی کلمات کے بغیر بھی متعلقہ امیدوار مستقل ملازمت والے زمرے میں آجاتا تھا۔ چونکہ باٹنی کے صدر شعبہ (پروفیسر

خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ دلی میں ان کی جائداد کو کسٹوڈین نے ایویکوئی پراپرٹی قرار دے دیا تھا۔ سالہا سال وہ عدالت میں جاتے رہے کہ میں نے کبھی سرحد پار نہیں کی۔ میں یہاں موجود ہوں۔ میں یوپی سرکار میں ڈپٹی کلکٹر ہوں۔ لیکن کسٹوڈین کی عدالت نے باور ہی نہیں کیا۔ اس پُرآشوب دور میں ایسی مثالیں وافر تھیں۔ سعید الدین حیدر صاحب کی بیگم رعنا حیدر صاحبہ شخصیت اور کشش والی خاتون تھیں، انھوں نے ایک روز بتایا کہ ان کی خالہ (یا پھوپھی یا چچی) نذر سجاد حیدر صاحبہ دہرہ دون سے چند روز کے لیے آنے والی ہیں۔ نذر صاحبہ کا ابتدائی نام نذر الباقر تھا۔ وہ دوسرے درجے کی اچھی خاصی ناول نگار تھیں لیکن جن صاحب سے (سجاد حیدر یلدرم) انھوں نے شادی کی ان کا شمار صفِ اول کے اہلِ قلم میں ہوتا تھا۔ ترکی ادب، انشا پردازی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی رجسٹراری کے ضمن میں ان کا نام آتا ہے اور آتا رہے گا۔ نذر سجاد حیدر صاحبہ کی خدمت میں حاضری کا کئی بار موقع ملا۔

ایک روز یہ نوید ملی کہ ان کی صاحبزادی قرۃ العین حیدر لکھنؤ یونیورسٹی سے چھٹی پر چند روز کے لیے رعنا حیدر صاحبہ کے پاس آرہی ہیں وہ انگریزی ادب میں ایم اے فائنل کا امتحان دے کر آرہی تھیں۔ لیجیے بہر ملاقات ایک تقریب ہاتھ آگئی۔ میں نے چار برس پہلے علی گڑھ سے انگریزی میں ایم اے کیا تھا۔ وہ پروفیسر سدھانت کی شاگردہ تھیں۔ میرے استاد پروفیسر ایف جے فیلڈین تھے۔ ہمارے "وائے وا" (زبانی امتحان) میں پروفیسر سدھانت آئے تھے۔ اشتیاق اور جستجو کے ساتھ میں انتظار کرنے لگا۔ نووارد کو سر سے پیر تک دیکھا۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

عنفوانِ شباب، زندگی سے بھرپور، لیاقت سے معمور، سراپا اعتماد، ہمہ افتخار، میانہ قد، گندمی رنگ، بالوں کی آرائش اور اونچی نشست نے قد میں اضافہ کر دیا تھا۔ غالب کے اس شعر کو مفہوم بدل کر پڑھیے۔

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرہ پُر پیچ وخم کا، پیچ وخم نکلے

گفتار میں گل افشانی کا انداز، استدلال پر جذبات حاوی، ابتدائے بلوغ کی بے ساختگی، ناپختگی اور طفلانہ پن۔ اقبال سے شیفتگی کا یہ عالم "جی چاہتا ہے اسے کھا جائیں"۔ ہر نگاہ میں ایک نیا انکشاف، بات چیت میں چہکنے کا سا انداز، زندگی کے ولولہ کی ہر ہر لفظ میں آہٹ۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ یہ ذہین طالبہ ایک درخشاں مستقبل کی دہلیز پر کھڑی تھی۔

سید حامد کو انگریزی میں ایم اے کیے ہوئے چار پانچ سال ہو گئے تھے۔ تازہ دم نووارد سے انگریزی ادب پر تھوڑی بہت گفتگو ہوئی۔ خیال کی لہر، یا، رو Stream of thought کا ذکر چھڑا۔ گفتگو میں اس کی حیثیت بیش تر سامع کی ہوتی تھی۔ اسے بھی یک گونہ زعم تھا لیکن کسی تخلیقی یا ذہنی لیاقت پر نہیں۔ اسے ناز تھا ہاکی اور ٹینس میں مہارت پر۔ جس طرح شاعر اپنے اچھے اشعار پر وجد کرتا اسی طرح ہاکی کا یہ کھلاڑی اس گول کو ابھی تک یاد کرتا ہے جو اس نے فریقِ مخالف کی عملی تحقیر کرتے ہوئے، اسے دل ربا اور خوش نما فریب دیتے ہوئے کیا تھا۔ وہ گول اس نے مخالفین کی ٹیم پر یکہ وتنہا ڈالا تھا۔ اس شاہکار گول کے تماشائیوں اور مداحوں کے اس جم غفیر میں جو یہ میچ دیکھ رہا تھا الہ آباد ہائی کورٹ کے جسٹس جیمس شامل تھے۔ ہر طرف سے داد ملی جو حافظہ میں نہ جانے کیوں اس گول کے ساتھ پیوست ہوگئی جو آگے چل کر میراڈونا نے فٹ بال کے ورلڈ کپ میں کیا تھا۔ ایک گول کے تذکرے کو اس قدر طول اس لیے دے دیا گیا کہ قارئین کو اس وابستگی کی آہٹ مل جائے جو مجھے کھیلوں سے تھی اور جو ہیئت بدل کر ابھی تک ہے، جب میں عمر عزیز کے ۳ کم ۹۰ سال طے کر چکا ہوں۔

سکسینہ) اور احقر کے درمیان روزِ اوّل سے ہی ابلیس اور لاحول والا رشتہ قایم ہوگیا تھا' لہٰذا خاکسار کو لمبی مدّت تک چپّی سادھ لینے میں ہی عافیت نظر آئی۔ تین سال تک یہ مَون برت جاری رہا مگر جب ایک ہزار ایک سو گیارہ دن گزر جانے کے بعد بھی مدت آزمائش کا آخری سرا نگاہوں سے اوجھل رہا تو انتظامیہ کی من مانی کے خلاف آواز اٹھانے کا من بنایا' چونکہ اب ناچیز قانونی اعتبار سے فتنۂ سامری کی زد سے باہر آچکا تھا' لہٰذا شیخ الجامعہ کے حضور میں تلخیِ لیل ونہار کا ذکر کرتے ہوئے جان کی امان چاہی اور شوقِ دیدار کا اظہار کیا' لیکن ان دنوں محافظ دستوں اور 'جاں نثاروں' کے حصار کو پھلانگ کر دریسّدی تک رسائی پاجانا، گویا کوہِ قاف کا طلسم توڑ کر آبِ حیات لے آنے کے مترادف تھا۔ جب کسی طرح پار نہ بسائی تو تھک ہار کر رجسٹرار کے در کی گدائی کو ہی غنیمت جانا کہ کوچۂ اقتدار کا ایک دریچہ یہاں بھی کھلتا تھا۔ لیکن رجسٹرار صاحب (ضمیر احمد خاں مرحوم) سے مل کر خلاف توقع مجھے ایسا لگا کہ شاید کسی فرشتۂ رحمت سے ملاقات ہوگئی ہے۔ موصوف کے حوصلہ افزا رویّے نے احقر کی بڑی ڈھارس بندھائی۔ تاہم ضروری نہ ہوتے ہوئے بھی وہ بار بار صدرِ شعبہ سے تحریر عدم اعتراض (NOC) بھیجنے کی فرمائش کرتے رہے (شاید اس لیے کہ وہ محض ایک صدر شعبہ ہی نہیں بلکہ شیخ الجامعہ کے خصوصی منظورِ نظر بھی تھے لہٰذا رجسٹرار صاحب انکی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے سے دامن بچا رہے تھے)۔ صدر صاحب نے عدم توجہی کو برقرار رکھا کیونکہ تین برس بحسن و خوبی گذر جانے کے بعد احقر کی مخالفت میں کچھ لکھنے کے اب وہ قانونی طور پر مجاز نہیں رہے تھے اور حق بیانی کا انہیں کوئی شوق نہ تھا' لہٰذا عدم کارروائی کے اس ماحول میں دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ اُدھر اقتدارِ اعلیٰ کے انتقال کی گھڑی بھی قریب آپہونچی تھی لہٰذا حامد صاحب اور ان کی ٹیم کے اراکین اپنے بستر باندھنے لگے اور احقر کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی' لیکن اللہ بخشے مرحوم ضمیر احمد صاحب کو کہ آخر کار مرضیِ سکسینہ پر خاک ڈالتے ہوئے جاتے جاتے وہ اس 'بیمار روزگار' کو سنجیونی بوٹی سونگھا ہی گئے۔ اسطرح ناچیز کی ملازمت پکّی ہوگئی اور پھر سکسینہ صاحب کے ساتھ جم کر کبڈّی کھیلی گئی۔

حامد صاحب جب علیگڑھ سے واپس ہوئے تو جامعہ ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید مرحوم نے انکو اپنا رفیق کار بنالیا تا کہ جنوبی دلّی کے تغلق آباد علاقے میں اک نئی یونیورسٹی کی بنیاد ڈال سکیں۔ ان دونوں حضرات کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں آخر کار ۱۹۸۹ء میں جامعہ ہمدرد کا وجود عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اختر حسین' جو بعد میں جامعہ ہمدرد کے اوّلین وائس چانسلر بنے، اور چند دیگر حضرات کا تعاون بھی نمایاں رہا' جن میں پروفیسر اخلاق الرحمان قدوائی (سابق گورنر اور رکن راجیہ سبھا)' پروفیسر علی محمد خسرو (سابق سفیر ہند اور شیخ الجامعہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی) اور پروفیسر سروپ سنگھ (سابق وائس چانسلر دلّی یونیورسٹی) خاص طور پر شامل تھے۔ ۱۹۹۰ء میں احقر کا دانہ پانی بھی جامعہ ہمدرد سے جُڑ گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر نو مولود جامعہ ہمدرد سے رشتہ نہ جوڑا ہوتا تو سیّد حامد کی ذات گرامی پر زندگی بھر تبرّہ ہی کرتا رہتا' کیونکہ علیگڈھ میں احقر یونیورسٹی برادری کی اس بڑی اکثریت میں شامل تھا جو موصوف کی آمرانہ روش اور ہٹ دھرمی کو سختی سے ناپسند کرتی تھی۔ بھلا ہو اس نقل مکانی کا کہ موصوف کو قدرے قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع مل گیا جس سے انکی ہمہ گیر شخصیت کے کچھ ڈھکے چھپے پہلو بھی نگاہ میں آگئے۔ جامعہ ہمدرد آنے کے بعد بھی موصوف سے متعارف ہونے میں خاصا وقت لگا۔ پہلے سال میں تو بات سلام و دعا سے آگے نہ بڑھ سکی۔ موقع ملنے پر تعارفی گفتگو میں احقر نے علیگڑھ سے اپنے طویل تعلق کا ذکر کیا اور بتایا کہ انہی کے دورِ اقتدار میں وہاں پر راقم کا بحیثیت استاد تقرر ہوا تھا۔ یہ بھی واضح کیا کہ قیامِ علیگڑھ کے دوران راقم کو انکے طریقۂ کار سے شدید اختلاف رہا مگر بعد میں انکے افکار ونظریات کی تبدیلی اچھی لگی، مثلاً پہلے وہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے ریزرویشن کی مخالفت کرتے تھے لیکن بعد میں وہ اس خیال کی نہ صرف تائید بلکہ پرزور وکالت کرنے لگے تھے۔ اس پوری رام کتھا کے جواب میں موصوف کی جانب سے 'جی' اور 'شکریہ' جیسے دو تین الفاظ موصول ہوئے [۲]۔

جامعہ ہمدرد کے تعلق سے بانیٔ ادارہ حکیم عبدالحمید مرحوم کے بعد سیّد حامد صاحب کا نام ہی سرفہرست نظر آتا ہے۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے مختلف رفاہی پروگرام بھی آپ ہی کے زیرِ نگرانی عمل میں آئے۔ حمید اور حامد کی جوڑی نے ہمدرد نگر اور تعلیم آباد قائم کر کے محض دس پندرہ برس میں ہی وہ کچھ کر دکھایا جو صدیوں کی جدوجہد پر بھاری پڑتا ہے۔ ان صاحبان نے تعلیم و تحقیق کے میدان میں شمالی ہند کے مسلمانوں کی غفلت و بے حسی کا کفارہ ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ جامعہ ہمدرد اور تعلیم آباد کے اداروں نے اپنے منفرد پروگراموں کے ذریعہ آزاد ہندوستان کے مسلم نوجوانوں کو علم وعمل کے میدان میں یقیناً اک نیا عزم' نیا حوصلہ عطا کیا ہے۔ حکیم عبدالحمیدؒ کی وفات کے بعد ۱۹۹۹ میں سیّد حامد صاحب کو جامعہ ہمدرد' نئی دہلی' کا امیر الجامعہ (چانسلر) منتخب کیا گیا اور پھر دو مرتبہ اس عمل کا اعادہ ہوا۔ چانسلر کی حیثیت سے انہوں نے جامعہ ہمدرد کے لیے کئی وائس چانسلروں کا انتخاب کیا۔ انتخاب اوّل جناب سراج حسین (IAS) نے حامد صاحب کے اعتماد کی پوری طرح لاج رکھی اور انکی قیادت میں بہت کم وقت میں جامعہ ہمدرد کا شمار ملک کے اعلیٰ ترین تعلیمی اداروں میں ہونے لگا۔ انکے جانے کے بعد احقر نے عبوری شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ادارے کی باگ ڈور سنبھالی اور سراج صاحب کی روش کو برقرار رکھتے ہوئے آٹھ دس ماہ کے عرصہ میں ہی چند قدم آگے بڑھنے کی کوشش کی' سب سے پہلے طلبا میں بڑھتی ہوئی شورش اور بے راہ روی کو مکمل طور سے ختم کیا' اقامت گاہوں میں طلبا کی غیر قانونی رہائش پر روک لگائی' یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے ملنے والی امداد کو کئی گنا بڑھانے کے لیے متعلقہ کابینی وزیر شری ارجن سنگھ کی رضامندی حاصل کی' داخلوں میں صدفی صد شفافیت کو یقینی بنایا' مسلم طلبا کے پچاس فیصد ریزرویشن کا پوری طرح نفاذ کیا' محنتی اسٹاف کی حوصلہ افزائی کے لیے انعام واکرام اور توصیفی سرٹیفکیٹ کی روایت قایم کی' فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ضمن میں کئی ملکی اور غیر ملکی اداروں کے ساتھ معاہدے کیے اور ان اساتذہ و دیگر ملازمین کو پروموشن دیا جنہیں اہل ہونے کے باوجود عرصہ دراز سے نظر انداز کیا جارہا تھا۔ یہ سب حامد صاحب کی مشفقانہ سرپرستی اور انکے مسلسل تعاون سے ممکن ہوسکا۔

۲۰۱۱ء میں مدّت منصبی پوری ہوجانے کے بعد بھی قاضی صاحب، حامد صاحب (چانسلر) سے تھوڑی تھوڑی مہلت مانگتے رہے۔ عاجز ہوکر جب ایک دن حامد صاحب نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب تو آپ کو جانا ہی ہوگا' تب ہمدرد خاندان میں ڈاکٹر قاضی کے معاونین کھل کر سامنے آگئے اور کہا کہ ہمیں انکی ضرورت ہے اور ہم انہیں روکے ہوئے ہیں۔ زندگی میں حامد صاحب کو کبھی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں ہوا تھا' علالت اور کبر سنی کے باعث وہ بے بس تھے' انکی خود اعتمادی کو زبردست دھکّا لگا' اس دن کے بعد اپنی زندگی میں وہ کبھی جامعہ ہمدرد نہیں آئے۔

مثبت اور تعمیری مقاصد کی تکمیل کے لئے وقت کی ایک ایک نس سے رس نچوڑ لینے والے دو ہی جیالے میں نے اپنی زندگی میں دیکھے ہیں۔ ایک تو تھے جامعہ ہمدرد کے بانی حکیم عبدالحمید اور دوسرے انہی کے رفیق کار جناب سیّد حامد۔ حکیم صاحب کی طرح سیّد صاحب کے شب و روز بھی نپے تلے انداز میں ایک مقرّرہ نظم کے مطابق بسر ہوتے تھے۔ نہ جانے ان کے وقت میں خالق کائنات نے کتنی برکت سمودی تھی کہ جن چوبیس گھنٹوں میں بسا اوقات ہم اپنے معمول کے فرائض بھی پورے نہیں کر پاتے، ان میں وہ نماز و تلاوت، اوراد و وظائف اور ورزش و چہل قدمی جیسے مستقل معمولات کے علاوہ نہ صرف ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کا پورا نظم ونسق سنبھالتے تھے بلکہ ہمدرد اسٹڈی سرکل، ہمدرد پبلک اسکول اور جامعہ ہمدرد کے گوناگوں مسائل کا بھی سامنا کرتے تھے۔ درجنوں لوگوں سے ملاقات کرنا،، اخبارات ورسائل کا نہ صرف مطالعہ کرنا بلکہ مباحث کے ردعمل میں اظہار خیال کرنا، دن بھر میں کئی کئی میٹنگیں اٹینڈ کرنا اور واقف کاروں کی خوشی اور غمی میں شریک ہونا حامد صاحب کا روز کا معمول تھا۔ کئی اردو اور انگریزی جریدوں کے لئے وہ پابندی سے مضامین لکھتے رہے' اور ایک انگریزی پندرہ روزہ 'دی نیشن اینڈ دی ورلڈ' کی ادارت بھی فرماتے۔ اس کے علاوہ بھی درجنوں مصروفیات ہوتی تھیں، کہیں تقریر و تبصرہ تو کہیں تنقید و تجزیہ، کہیں سنجیدہ مسائل پر غور وخوض تو کہیں شعر و ادب پر داد و تحسین، کہیں جشن افتتاح تو کہیں بزم اختتام، لیکن کبھی بھی بیزاری یا عدم دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ پھر گھریلو زندگی کے دندان شکن مسائل اپنی جگہ، اہلیہ محترمہ کی طویل علالت سے پیدا شدہ خانگی مسائل نے موصوف کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا مگر کیا مجال کہ حرفِ شکایت کبھی زبان پر آیا ہو۔ نجی مشکلات کو حامد صاحب نے کبھی بھی فرائض منصبی پر حاوی نہیں ہونے دیا' اور چہرے کو بھی یہ اجازت نہ دی کہ وہ قلب وذہن کی چغلی کھائے۔ [۲]

موصوف کی قوتِ ضبط و تحمّل کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مارچ ۲۰۱۲ میں جب انکے عزیز داماد جناب حسن غفور (ریٹائرڈ پولیس کمشنر، ممبئی) کا اچانک دورۂ قلب سے انتقال ہوا تو موصوف کافی زیادہ علیل تھے لہٰذا گھر والوں نے یہ طے کیا

کہ یہ غمناک خبر فی الحال ان تک نہ پہونچنے دی جائے۔ کچھ دنوں تک اخبار، ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون کو انکی دسترس سے دور رکھا گیا۔ بغرض ملاقات آنے والوں کو پہلے ہی بتا دیا جاتا تھا کہ اس واقعے کا ذکر زبان پر نہیں آنا چاہیے۔ کافی وقت گذر جانے پر اہل خانہ اور عزیز و اقارب یہ سوچ کر مطمئن تھے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہے اور سیّد صاحب کو اس اندوہناک حادثے کی بھنک نہیں لگی، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ صورت حال سے واقف ہو چکے تھے مگر خاموش تھے۔ حسن غفور صاحب جو اپنی زندگی میں مسلسل سیّد صاحب سے فون پر رابطہ بنائے رکھتے تھے، اب مستقل طور پر غایب تھے مگر سیّد صاحب نے خلاف توقع نہ کبھی انکی خیریت معلوم کی اور نہ ہی کسی سے یہ پوچھا کہ اتنی مدّت سے انکا فون کیوں نہیں آیا ہے۔ بیٹی سے بات کرتے تو بھی انکے شوہر کی خیریت نہ پوچھتے۔ اہلیہ محترمہ کے انتقال کے موقع پر محض بیٹی اور نواسی کے آنے پر اور حسن کے نہ آنے پر بھی کوئی استفسار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ دو برس بعد جب انکی نواسی کی شادی کا اہتمام بھی ممبئی کے بجائے دلّی سے کیا گیا اور حسن غایب رہے، تب بھی سیّد صاحب نے یہ نہ پوچھا کہ حسن کہاں ہیں۔ لڑکی کی شادی میں باپ کی غیر حاضری پر نہ کوئی استفسار، نہ حیرت کا اظہار، گویا سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ خاموشی سے شب و روز کا تماشہ دیکھتے رہے اور زندگی کے آخری لمحے تک کبھی اپنے چہیتے داماد کا نام زبان پر نہیں لائے۔ ایسا متحمل مزاج شخص میں نے اپنی زندگی میں کوئی دوسرا نہیں دیکھا[۸]۔

انسانی معاشرے میں ایسی شخصیتیں ہمیشہ گنی چنی ہی ہوتی ہیں جو صورت میں، سیرت میں، تقریر و تحریر میں، اخلاق و اخلاص میں، غرضیکہ کردار و گفتار کے ہر شعبے میں نابغۂ روزگار ہوں اور جنکی زندگیاں 'یقین محکم، عمل پیہم' والے کلّیہ کی روشن تفسیر ہوں۔ حامد صاحب اللہ کے ایسے ہی خوش صفات بندوں میں سے ایک تھے۔ کبرسنی کے دور میں بھی ان کی خوب روئی اور خوش جمالی مسلّم رہی۔ ایام شباب میں تو یقیناً وہ اپنے عہد کے یوسف رہے ہوں گے۔ اخلاقیات کے معاملے میں بھی سیّد صاحب ایک مثالی کردار تھے۔ تبسم ریز پُر سکون چہرہ، روشن آنکھیں اور نیچی نگاہیں، مخاطب کی جانب سراپا متوجہ، سلام کا جواب دیں تو اس میں محض زبان کا ہی نہیں بلکہ چشم و ابرو اور دست و گردن کا تعاون بھی نمایاں نظر آئے۔ عجز و انکسار ایسا کہ مخاطب کے لئے سامان شرمندگی بن جائے۔ زبان اس درجہ شیریں اور محتاط کہ مخالفین کا ذکر بھی قصیدہ خوانی معلوم ہو۔ اگر برہمی اور ناپسندیدگی کا اظہار کریں تو 'ظلمت زادے' اور 'کج فکرے' جیسی تراکیب وضع کر کے زبان و بیان کو نئی وسعتیں بخش دیں۔

حالانکہ سیّد صاحب انتہائی کم گو تھے لیکن اس کم کلامی کے باوجود مخاطب ان کے حسن کلام اور زور ظرافت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مختصر سی ملاقات میں بھی انکے ایک دو جملوں کا ذہن میں چپک جانا لازمی تھا۔ ایک روز احقر نے جناب سراج حسین (سابق وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد) کی حوصلہ مندی اور خوش نظمی کا تذکرہ کیا تو حامد صاحب نے خود احقر کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا ''شانے آپ کے بھی فراخ ہیں''۔ ایک مرتبہ راقم نے ان کے آفس میں فائلوں کے انبار پر کلام اللہ کی کئی تفاسیر رکھی دیکھیں تو قدرے جھجکتے ہوئے دریافت کیا کہ اس درجہ مصروفیت کے باوجود وہ اس سنجیدہ مطالعہ کے لیے وقت کیسے نکالتے ہیں؟'' حسن ظرافت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ''لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے محض سامنے رکھ لینے میں کیا حرج ہے؟'' [۲]

حامد صاحب کی تقریر خواہ اردو میں ہو یا انگریزی میں، سامعین کو نئے الفاظ و تراکیب سے آشنا کرتی تھی۔ موزوں الفاظ کا برمحل استعمال ان کی تقریر اور تحریر دونوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ تیس بتیس برس پہلے، موصوف نے 'ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل' پر خدا بخش لائبریری، پٹنہ میں ایک توسیعی خطبہ پیش کیا تھا جو بعد میں اسی عنوان سے شائع ہونے والی ایک کتاب کا باب اوّل بنا۔ کہا جاتا ہے کہ اس خطبے کا پہلا آدھا حصہ تحریر شدہ تھا جب کہ نصفِ آخر فی البدیہہ خطاب پر مشتمل تھا مگر سامعین قطعی کوئی فرق محسوس نہ کر سکے۔ خیالات کی روانی، جملوں کی ساخت اور الفاظ کی موزونیت از اوّل تا آخر یکساں طور پر برقرار رہی۔

حامد صاحب کی اردو نہ تو مولویوں والی اردو تھی جس پر عربی یا فارسی کا گمان ہونے لگے اور نہ ہی آپکی اور ہماری والی اردو تھی جو انگریزی کے ساتھ پکائی ہوئی کھچڑی دکھائی دے۔ انکے وہاں اردو کا مطلب اردو ہی ہوتا تھا لیکن شستہ اور شیریں۔ ایک مرتبہ کسی تقریب میں وہ ذرا دیر سے پہونچے کیونکہ دلّی سے آنے والی فلائٹ قدرے لیٹ ہو گئی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آج موصوف کی اردو تقریر میں انگریزی کے الفاظ سننے کو مل سکتے ہیں کیونکہ فلائٹ کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ بہر حال حامد صاحب کی تقریر کا آغاز کچھ اسطرح سے ہوا کہ 'پرواز میں تاخیر کے باعث حاضری میں تاخیر ہوئی'۔

موصوف اردو کے عظیم قلمکار تھے۔ انشاء پرداز کی حیثیت سے دنیائے ادب میں انہیں یقیناً ایک منفرد اور محترم مقام حاصل تھا۔ کئی سو بلند پایہ مضامین کے علاوہ (۳۸۸ مضامین کی فہرست تو میرے پاس موجود ہے، اسکے علاوہ بھی کافی کچھ لکھا ہے) انکی تصنیفات میں قوس قزح (۱۹۴۶)، نگار خانۂ رقصاں (۱۹۸۴)، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل (۱۹۸۶)، لمحات (۱۹۸۷)، کرب آگہی (۱۹۸۷)، آزمائش کی گھڑی (۱۹۹۳)، قلم اور قدم (۱۹۹۵)، نقوش جاوید (۲۰۰۲)، غور و فکر (۲۰۰۲)، شیرازہ (۲۰۰۲)، مضامین سیّد حامد (۲۰۰۲)، روشنی کے مینار (۲۰۰۲)، فریاد (۲۰۰۲)، مسلمانوں کی پسپائی کے اسباب اور پیشرفت کی تدابیر (۲۰۰۳)، تعلیم اور عصری تقاضے (۲۰۰۴)، اور فانوس کی گردش (۲۰۰۹) جیسی شہرہ آفاق کتب شامل ہیں۔ 'ہندستانی مسلمانوں کے مسائل' کتاب کے پیش لفظ میں جناب عابد رضا بیدار نے مصنف کے طرز تحریر کو رشید احمد صدیقی مرحوم کے اسلوب نگارش سے مشابہ قرار دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو میں ایک اچھے صاحب طرز نثر نگار کا اضافہ ہو چکا ہے۔

.... اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ الفاظ و تراکیب پر سیّد حامد کی گرفت بہت مضبوط ہے، انکے خیالات میں مقصدیت اور تحریر میں روانی ہے۔[۹]

بسا اوقات حامد صاحب کی تقاریر و تحاریر کا محور (۱) حصول علم، (۲) تحفظ صحت، (۳) اصلاح معاشرہ یا (۴) فرزندان وطن کے درمیان باہمی روا داری ہوا کرتا تھا۔ ان مقاصد کے تئیں بیداری پیدا کرنے کی غرض سے موصوف نے صرف جوہر صحافت کا ہی استعمال نہیں کیا بلکہ دُور دراز علاقوں کا سفر بھی اختیار کیا، کارواں بنائے اور شہر شہر، قریہ قریہ لوگوں کو نشان منزل دکھاتے پھرے۔ اللہ کا شکر ہے ملّت میں بیداری کے کچھ آثار نظر آنے بھی لگے، خدا کرے کہ آنیوالے دنوں میں یہ رنگ مزید نکھرے اور موصوف کی عدم موجودگی میں بھی انکا مشن جاری و ساری رہے۔

تحفّظ صحت کے بارے میں اظہار خیال فرماتے ہوئے زبان کے چٹخارے کو سیّد صاحب معدے کا دشمن قرار دیتے تھے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ معدے کی بدحالی بسا اوقات پورے جسم کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے طبّ یونانی کے ماہرین تمام بیماریوں کے علاج کا آغاز اصلاح معدہ سے کرتے ہیں۔ نوجوان طلبا سے سیّد صاحب کثرت مطالعہ کے ساتھ ساتھ صحت جسمانی کی نگہداشت کے بھی متقاضی ہیں۔ ملک و ملّت کے آنے والے کل کو سیّد صاحب تندرست و توانا دیکھنا چاہتے تھے، مدقوق و معذور نہیں۔ ورزش اور کھیل کود سے حامد صاحب کو ایک خاص شغف رہا۔

ناخواندگی، مفلسی اور بے روزگاری سے پریشان ہندوستانی مسلمان کی زندگی آج توہمات، غیر اسلامی رسومات اور آپسی رنجشوں و مخالفتوں کے در آنے سے مزید بدحال ہو گئی ہے، اس ضمن میں اصلاح کے لیے کوئی قابل اعتنا کام بھی نہیں ہو سکا ہے۔ مذہبی تحریکوں کی توجہ بھی محض توحید اور عبادات کی اہمیت پر ہی مرکوز رہی ہے۔ سماجی زبوں حالی کے ضمن میں سیّد صاحب ان تمام مہلک رسومات اور اخلاقی عوارض کا احاطہ کرتے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے متضاد ہونے کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کی روز مرّہ کی زندگی میں پوری طرح سرایت کر گئے ہیں اور اُن کے پیہم زوال کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ان عوارض میں فضول خرچی، جہیز، جہالت، رشوت، بغض و حسد، جذباتیت، عیب جوئی، ریاکاری، شیخی خوری، حق تلفی، دھوکہ دہی اور بد اخلاقی جیسے متعدد چھوٹے بڑے عارضے شامل ہیں جو آج ہمارے ملّی تشخّص کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔

فرزندان وطن کے درمیان افہام و تفہیم کی فضا اور خوشگوار باہمی تعلقات کو حامد صاحب نہ صرف ہندی مسلمان کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کی ترقی و خوشحالی کے لئے ناگزیر تصور کرتے تھے۔ حامد صاحب کا یہ طرز فکر، بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سر سیّد احمد خاںؒ کے اس یقین کا آئینہ دار تھا جس کی عکّاسی سر سیّد مرحوم کے درج ذیل الفاظ سے ہوتی ہے جو انکے خطبۂ جالندھر (۴ فروری ۱۸۸۴ء) سے ماخوذ ہیں:

''اے صاحبو! صدیاں گذر گئیں جب سے خدا کو یہ منظور ہوا کہ ہندو اور مسلمان اسی ملک کی ہوا اور پیداوار کھائیں، اسی زمین پر جئیں اور اسی پر مریں، ان واقعات سے خدا کی یہ مرضی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ دونوں گروہ باہم دوست ہو کر بلکہ دو بھائیوں کی طرح ہندوستان میں رہیں۔ ہندوستان کے خوب صورت

چہرے کی یہ دونوں دو آنکھیں بنیں۔ یہ دونوں قومیں جو دال اور چاول کی طرح سے مل گئی ہیں، متفق ہو کر رہیں۔ جب تک یہ اتفاق نہیں ہوتا ہے بے شک قومی تعلیم کا بھی بندوبست نہیں ہوسکتا۔ اگر ہندو اپنی دو پتّھروں کی اور مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدا جدا عمارت بنائیں گے تو کچھ نہ ہوسکے گا۔ ان دونوں کو چاہئے کہ متفق ہو کر پہلے ایک کام کو پورا کریں۔ اور جب وہ ختم ہوجائے تو دوسرے میں ہاتھ لگائیں۔'' [۱۰]

آزاد ہندوستان میں آپسی بھائی چارے کی ترغیب اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی تاکید یقیناً وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

دور حاضر میں حامد صاحب سر سیّد احمد خاں کے سب سے بڑے مدّاحوں میں سے ایک رہے ہیں۔ اور سر سیّد کی تعلیمی تحریک کو رواں دواں رکھنا ان کی اوّلین ترجیح تھی۔ علی گڈھ سے حامد صاحب کا ایک جذباتی رشتہ آخر دم تک قایم رہا' مادر درسگاہ سے دائمی وابستگی انہیں علی گڈھ سے لاتعلق ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی دو عظیم درسگاہوں کی سربراہی حامد صاحب کے حصہ میں آئی۔ انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور جامعہ ہمدرد کے چانسلر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ حیدرآباد کی مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی کے قیام وفروغ میں بھی موصوف کی کوششوں کو کلیدی حیثیت حاصل رہی۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایک علاحدہ یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے بھی عرصۂ دراز تک کوشاں رہے۔ مگر ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ سابق وزیر اعظم من موہن سنگھ کی قائم کردہ 'جسٹس راجندر سچر کمیٹی' کے رکن کی حیثیت سے اور پھر اس کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کو ممکن بنانے کی غرض سے تشکیل کردہ 'فاطمی کمیٹی' کے رکن کی حیثیت سے مسلمانوں کے مسائل کی نشان دہی اور ان کے حل کی تلاش میں آپ کا تعاون مثالی تھا۔ حامد صاحب کی تعلیمی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں انہیں ۲۰۰۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ سے سرفراز کرکے آندھرا پردیش حکومت نے ایک اچھا کام کیا تھا۔ حامد صاحب کے اوصاف حمیدہ کا احاطہ کرتے ہوئے متعدد مضامین لکھے گئے اور انکے مجموعے کتابی شکل میں بھی سامنے آئے' اس ضمن میں سیّد حامد: نگارخانۂ رقصاں کی روشنی میں (نجمہ شہریار' ۱۹۸۷)' عرفانِ سیّد حامد (اصغر عباس وشہاب الدین ثاقب' ۲۰۰۱)' اور سیّد حامد: کہ گم اسمیں ہیں آفاق (نجمہ محمود' ۲۰۰۳) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انگریزی میں بھی دو کتابیں بعنوان ' Saiyid Hamid: Muslim face of India (مشتاق مدنی' ۲۰۰۹)' اور ' Saiyid Hamid: A relentless reformer (محمد علیم' 2012) منظر عام پر آئیں۔

یہ صحیح ہے کہ حامد صاحب اپنی دھُن کے پکّے تھے۔ ایک بار جو سوچ لیتے' اس پر مضبوطی سے قایم رہتے تھے۔ کوئی بات ذہن میں بیٹھ جائے تو پھر کسی دلیل وحجت سے قایل ہوجانا ان کا شیوہ نہیں تھا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کچھ مفروضے اور ذاتی احساسات (جن میں سے کئی بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے) ان کے نزدیک کلّیہ کی حیثیت رکھتے تھے' مثلاً یہ کہ:

۱۔ ماتحت ہی غلطی پر ہوتا ہے۔

۲۔ فیصلے واپس لینے کے لئے نہیں کیے جاتے۔

۳۔ تعلیمی اداروں کی سربراہی کے لئے بھی بیوروکریٹ ہی بہتر ہیں۔

۴۔ اداروں کی سربراہی کے لئے اندرونی امیدوار موزوں نہیں ہوسکتے۔

۵۔ غیر مسلموں کے بارے میں مسلمانوں کی شکایات عموماً بے بنیاد ہوتی ہیں۔

۶۔ ادارے افراد سے بڑے ہوتے ہیں۔

۷۔ اداروں کی فلاح کے پیش نظر ملازمین کو کم اجرت پر اکتفا کرنا چاہئے۔

بہرکیف کوئی کچھ بھی کہے، کچھ بھی سوچے، یہ حقیقت ہے کہ حامد صاحب نے کبھی کسی کو خضر راہ بنانا گوارا نہیں کیا اور اپنا راستہ ہمیشہ خود تلاش کیا۔ وہ بہ بانگ دہل اعلان کرتے رہے کہ دنیا کی کوئی طاقت، کوئی ترغیب اور کوئی دھمکی انہیں اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔ بظاہر اس دعوے سے کبر ونخوت کی بو آتی ہے لیکن یہ ایک ایسے عزم واستقلال کی غمّازی بھی کرتا ہے جسکا آج کے انسان میں عام طور پر فقدان ہے۔ یہ وصف تبھی پیدا ہوسکتا ہے جب انسان مصالح سے قطع نظر کرکے اور نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر محض عدل کا دلدادہ ہوجائے۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں وہ وقت سے مات کھا گئے۔ واقف کاروں کے مسلم اور غیر مسلم دونوں حلقوں میں ان کی بے لوث خدمات کا یکساں اعتراف کیا گیا۔ حامد صاحب کے مجموعۂ مضامین 'فریاد' کی رسم اجرا کے موقع پر ہندوستان کے سابق وزیر اعظم شری اندر کمار گجرال نے خدماتِ حامد کا ذکر کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی کی زبان میں فرمایا تھا:

''ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا ہے''۔

جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے میں نے کچھ دنوں حامد صاحب کو قدرے قریب سے دیکھا ہے۔ مجھے وہ ایک پرعزم' بلند حوصلہ' جفاکش اور مخلص انسان نظر آئے' خود غرضی اور ریاکاری سے کوسوں دوُر۔ ان کو دانشور کہنے میں تو مجھے تاّمل ہے لیکن محنت' لگن' ایثار' قوت ارادی' خود اعتمادی' اور ملّی ہمدردی انکے سینے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ ایک بلند پایہ مصنف اور صحافی تھے' اردو اور انگریزی زبانوں پر انکی گرفت بہت مضبوط تھی' کچھ لوگ انکی فارسی کے بارے میں بھی یہی گمان رکھتے ہیں۔ یہ بات شاید کم لوگ جانتے ہیں کہ موصوف ایک کہنہ مشق شاعر بھی تھے۔ انکا یہ شعر تو بہت ہی مقبول عام ہوا:

''ایک دو زخم تو کیا، سارا جگر ہے چھلنی
درد بے چارہ پریشاں ہے کدھر سے اٹھے''

پدم شری اور پدم بھوشن جیسے قومی اعزازات کے لئے جامعہ ہمدرد نے کئی مرتبہ موصوف کی نامزدگی کا قصد کیا مگر اُن کی جانب سے سخت مزاحمت کے باعث ہر بار قدم روکنے پڑے۔ ایک مرتبہ عوامی بیداری اور فروغ تعلیم کے میدان میں ایک بڑے ایوارڈ کے لئے حامد صاحب کی خدمات کا تفصیلی خاکہ تیار کرکے ہم نے متعلقہ وزارت میں جمع کرانے کی ٹھان لی اور سیّد صاحب سے اصرار کیا کہ وہ معترض نہ ہوں اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔ مگر وہ رضامند نہ ہوئے اور انتہائی عجز کے ساتھ فرمایا ''ڈر لگتا ہے کہ دنیا میں ہی سب کچھ پالیا تو کہیں آگے محرومی نہ ہوجائے''۔ ذہن کو جھنجھوڑ دینے والے ان الفاظ پر میں جب جب غور کرتا ہوں' رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایسی آواز اسی دل سے نکل سکتی ہے جو فکرِ آخرت سے مضطرب اور خوفِ خدا سے لرزاں ہو [۸]

ہمارا خیال ہے کہ نظریاتی اتفاق واختلاف اپنی جگہ لیکن شدت ہر نہج پر ناپسندیدہ اور غیر مطلوب ہے۔ مزید یہ کہ کسی کو ہدف تنقید بناتے وقت ہمیں یہ بھی ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ ہم خود کہاں کھڑے ہیں۔ عوامی خدمت اور تعمیر ملّت میں ہمارا اپنا یوگ دان کتنا ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں جب ہر سُو نفسی نفسی کا شور برپا ہے' اگر کوئی شخص ملّتی ملّتی کی صدائیں بلند کرتا نظر آئے تو میں سمجھتا ہوں کہ اپنی جملہ کوتاہیوں اور ذاتی کمزوریوں کے باوجود وہ قابل صد احترام ہے اور ہمارے درمیان اس کی موجودگی اللہ کا ایک انعام ہے۔ عصر حاضر میں سیّد حامد صاحب کی شخصیت اس کسوٹی پر بڑی حد تک کھری اتری' اور کوتاہ قدوں کی وسیع وعریض بستی میں وہ بہرکیف دیو قامت نظر آئے۔ اب ان جیسا کوئی دوسرا ذرا مشکل سے ہی دکھائی دیگا۔

خداوند کریم موصوف کے بھلے کاموں کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے انہیں جنت الفردوس کے اعلیٰ مراتب عطا فرمائے!

حوالے:

۱. محمد علیم (۲۰۱۲): Saiyid Hamid, a Relentless Reformer (سیّد حامد' ایک جارح مصلح) گلوریارڈ پبلیکیشنز' نئی دہلی.

۲. محمد اقبال (۲۰۰۸): سیّد حامد' ایک منفرد شخصیت۔ ماہنامہ تہذیب الاخلاق' علی گڑھ (دسمبر ۲۰۰۸)۔ ص ۲۳-۳۰.

۳. ایم. آئی. بھارتی (۲۰۱٦): The Mahabharat of Jamia Hamdard (جامعہ ہمدرد کا مہابھارت)۔ ایجوکیشن انڈیا' نئی دہلی.

۴. دانش احمد خاں (۲۰۱۲): Son puts Hamdard University Chancellor Saiyid Hamid under 'House Arrest' (ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر سیّد حامد بیٹے کے ہاتھوں گھر میں نظر بند)۔ IndianMuslimObserver.com (28.10.2012)۔

۵. دانش احمد خاں (۲۰۱۳): Indian Muslim Observer story on 'house arrest' of Jamia Hamdard Chancellor Saiyid Hamid stands true. (جامعہ ہمدرد کے چانسلر سیّد حامد کی گھر میں نظر بندی پر 'انڈین مسلم آبزرور' کی کہانی کی تصدیق)۔ IndianMuslimObserver.com (39.09.2013)

٦. ق.س. (۲۰۱۳): سیّد حامد اپنے ہی گھر میں محصور ومجبور۔ روزنامہ قومی سلامتی' نئی دہلی (۷۔ اگست ۲۰۱۳).

۷. قمر تبریز ۲۰۱۳۰): وائس چانسلر جی. این. قاضی کی دھاندلیوں کی شکار ہمدرد یونیورسٹی۔ ہفت روزہ چوتھی دنیا' نئی دہلی (۱۲-۱۸ اگست ۲۰۱۳)

۸. محمد اقبال (۲۰۱۵): اے کہ تو مجموعۂ خوبی......۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا' (دستاویز) نئی دہلی' (۹۔ جنوری' ۲۰۱۵) ص ۸.

۹. محمد اقبال (۱۹۸۸): نقد ونظر: 'ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل' (مئولفہ سیّد حامد' سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ)۔ ماہنامہ دوام نو' ٹانڈہ (مارچ ۱۹۸۸)۔ ص ۴۳-۴۴ اور ۴۰.

۱۰. محمد اسماعیل پانی پتی (۱۹۷۲): خطبات سر سیّد۔ مجلس ترقی ادب' لاہور' پاکستان

۱۱. محمد اقبال (۱۹۹۰)): حکیم عبدالحمید' سادگی' انکساری اور خوش مزاجی کا پیکر۔ ماہنامہ ایوان اردو' نئی دہلی (نومبر' ص ۳٦-۴۱).

***

Sufism

by Prof. Syed Hasan Askari

The advent of Islam in India was followed by that of Sufism, the name given to the mystical, humanistic, speculative or rational and spiritual movement in the religion founded by the Prophet of Arabia. The suffix 'ism' suggests it to be a sect or creed, dogma or doctrine, definite and systematised; it is neither. Mysticism in Islam as in other religions, is less a doctrine than a certain mode of thinking, feeling and acting. It is an art or way to find out and attain God. The term mystical signifies a doctrine concerning the way to God in perfections derived from inner experiences, and interpretations rather than from deduction or reasoning. The earliest Sufis were a sect of ascetics and quietists as well as those whose aim was to purify and spritualise Islam from within, and give it a deeper mystical interpretation' and infuse in it a spirit of love. Prof. Arberry defines Mysticism as a "constant and unvarying phenomena of the universal yearning of the human spirit for personal communion with God". Sufism was originally a practical system of religious beliefs and not a speculative system. It was a system of thought or action based on noble ideals of human nature, holding that man is capable of self-fulfilment and of ethical conduct. It absorbed the essence of Islamic teachings, the wisdom of the ancient Masters and the learning of the humanists. It assimilated many a divergent ingredient and presented them in a new dress. A time soon came when it broke with the formal, dogmatic theory by giving a new and fresh interpretation of the Creator and the Creation. It became Monistic rather than dualistic, believing in identity and fusion rather than separation like orthodox Islam. The theologians, jurists and traditionalists adhered to the letter of the law and detailed formulas and set rules of rituals and ceremonies which were fixed and were to be followed in daily life. There grew a new tendency of pantheistic mysticism which, according to Stobart, "developed itself chiefly in a search for metaphisica1 purity for illumination of the mind, for calmness of soul, and for subjugation of passions by the exercise of painful austerities and the adoption of ascetic life". The adherents of the system believed that the Divine nature pervaded all things and gave its very essence and being to the soul itself, which thus sought to gain a conformity to the Supreme Being, and more and more to sever itself from the things of earth, like a wearied traveller, seeking to terminate the period of exile from its original. The final object of the Sufi devotee is to attain the Light of Heaven, towards which he must press forward till perfect knowledge is reached in his Union with God, to be consummated, after death, in absorption into the Divine Being".

Islamic mysticism or the School of inner spirit, giving an inner and esoteric interpretation of the teachings of the Quran and the sayings and practices of the prophet, and challenging very often the power of the School of formal or externalist theologians, arose as a revitalising current in Islam between the 9th and 10th centuries and attained its fullest and classical form in the 12th and 13th centuries from the works of a group of intellectuals to whom the terminology of Mystics could be applied. They consisted of most educated men, emotional writers, and poets in Persia, Central Asia and throughout the East. By the time it came to India, Muslim mystic thought and philosophy, regarded as embodying the vital flexible spirit of Islam, the core of the belief whereof was the relationship of 'I & Thou' had already been well established outside our country.

***

President of Indian National Congress Ramgarh Session (1940)

SIR SYED'S ARDENT DISCIPLE SPEAK AS

by Abul Kalam Azad (1888-1958)

I am a Musalman and am proud of that fact. Islam's splendid traditions of thirteen hundred years are my inheritance. I am unwilling to lose even the smallest part of this inheritance. The teaching and history of Islam, its arts and letters and civilisation, are my wealth and my fortune. It is my duty to protect them.

As a Musalman I have a special interest in Islamic religion and culture, and I cannot tolerate any interference with them. But in addition to these sentiments, I have others also which the realities and conditions of my life have forced upon me. The spirit of Islam does not come in the way of these sentiments; it guides and helps me forward.

I am proud of being an Indian. I am a part of the indivisible unity that is Indian nationality. I am indispensable to this noble edifice, and without me this splendid structure of India is incomplete. I am an essential element which has gone to build India. I can never surrender this claim.

It was India's historic destiny that many human races and cultures and religions should flow to her, finding a home in her hospitable soil, and that many a caravan should find rest here. Even before the dawn of history, these caravans trekked into India, and wave after wave of newcomers followed. This vast and fertile land gave welcome to all, and took them to her bosom. One of the last of these caravans, following the footsteps of its predecessors, was that of the followers of Islam. This came here and settled here for good.

This led to a meeting of the culture-currents of two different races. Like the Ganga and Jumna, they flowed for a while through separate courses, but nature's immutable law brought them together and joined them in a sangam. This fusion was a notable event in history. Since then, destiny, in her own hidden way, began to fashion a new India in place of the old. We brought our treasures with us, and India too was full of the riches of her own precious heritage. We gave our wealth to her, and she unlocked the doors of her own treasures to us. We gave her what she needed most, the most precious of gifts from Islam's treasury, the message of democracy and human equality.

Full eleven centuries have passed by since then. Islam has now as great a claim on the soil of India as Hinduism. If Hinduism has been the religion of the people here for several thousands. of years, Islam also has been their religion for a thousand years. Just as a Hindu can say with pride that he is an Indian and follows Hinduism, so also we can say with equal pride that we are Indians and follow Islam. I shall enlarge this orbit still further. The Indian Christian is equally entitled to say with pride that he is an Indian and is following a religion of India, namely Christianity.

Eleven hundred years of common history have enriched India with our common achievement. Our languages, our poetry, our literature, our culture, our art, our dress, our manners and customs, the innumerable happenings of our daily life, everything bears the stamp of our joint endeavour. There is indeed no aspect of our life which has escaped this stamp. Our languages were different, but we grew to use a common language; our manners and customs were dissimilar, but they acted and reacted on each other, and thus produced a new synthesis. Our old dress may be seen only in ancient pictures of bygone days; no one wears it today.

This joint wealth is the heritage of our common nationality, and we do not want to leave it and go back to the times when this joint life had not begun. If there are any Hindus amongst us who desire to bring back the Hindu life of a thousand years ago and more, they dream, and such dreams are vain fantasies. So also if there are any Muslims who wish to revive their past civilization and culture, which they brought a thousand years ago from Iran and Central Asia, they dream also, and the sooner they wake up the better. These are unnatural fancies which cannot take root in the soil of reality. I am one of those who believe that revival may be a necessity in a religion but in social matters it is a denial of progress.

This thousand years of our joint life has moulded us into a common nationality. This cannot be done artificially. Nature does her fashioning through her hidden processes in the course of centuries. The cast has now been moulded and destiny has set her seal upon it. Whether we like it or not, we have now become an Indian nation, united and indivisible. No fantasy or artificial scheming to separate and divide can break this unity. We must accept the logic of fact and history, and engage ourselves in the fashioning of our future destiny. (extr.)

***

Reader's Cornor

From: Alig Brotherhood
علیگ عزیزوں کے خط

اس صفحہ پرآپ علیگ عزیزوں کے خط پڑھیں گے۔ کچھ ایسے مکتوب نگار بھی اس میں شامل ہیں، جن کے محترم والدین، اہلیہ، یا دوسرے blood relations علی گڑھ سے وابستہ رہے ہیں۔ مثلاً سیدین صاحب، شاہ حسن عطا صاحب، سلمیٰ عمرو غیرہ۔

Adaab
I read Sir Syed's speech: Exactly what Maulana Azad said in Ramgarh in 1940.
With respect,
- Syeda (Syedain)

Masha-Allah, a wonderful initiative. I wish you all the best in this endeavor. Hope and pray to receive this in the future with continuity. It will also be a great step if all these can be placed on a web portal so that it can easily be accessed if missed in email.
Thanks, with regards,
- Afzal Usmani (Washington DC)

Good initiative.
Wajihuddin (Mumbai)

Jazakallah, Aapka karam aur inaayat… Aapne hausla badhaya… - **Pervaiz (Talib)**

Thanks a lot for sharing. I wish you all the best. I shall also contribute something.
- Prof. Latif Hussain Shah Kazmi
Professor & Chairman
(Philosophy, Aligarh)

The wonderfully written presentation. I fully enjoyed this contribution alongwith Abdul Hafeez Khan. My late father was in Incharge of GR Police at Hardoi, and for a day or two at Shahjahanpur, Hafeez Khan's town.
- Professor Dr. Alay Ahmad
Former Vice President, Aftab hall Cultural Society. A resident of Morrison Court, Aftab Hall , Aligarh Muslim University

---

Thanks for sharing the two issues of Aligarh Diaspora. I look forward to reading them: a sure way to remain in touch with my beloved Alig biradari.
-Nadeem Rezavi (History, AMU)

Thanks a lot for sharing.
Rashid Shaz (Aligarh)

بھٹنا گر صاحب کا ذکر تو آپ نے کیا، مگر ان کا pet sentence لکھنا بھول گئے، وہ کہتے تھے: Aligarh is running in my blood یہ جملہ شاید آپا نے اپنی کتاب ''رشید احمد صدیقی کے خط بھٹنا گر صاحب کے نام'' کے مقدمہ میں لکھا ہے۔ طارق جیلانی

It is a privilege and honour to receive two emails containing the most comprehensive and thought-provoking Urdu and English articles concerning AMU, its history and rich culture. Indeed, all the articles are very interesting and deeply highlight the wide-range of dialogues and the literary activities of a highly-remarkable institution (AMU) of the Indian sub-continent in particular and world in general.
I am well aware of these great academicians, whose, names are mentioned here to bring the attention of the readers for their wisdom, commitment, sincerity, dedication and the generosity for Sir Syed's (R.A), Aligarh movement and its dynamic mission around the globe.
- Shah Umar Ata (London)

It was very nice to talk to you on the phone.
I suggest please consider requesting to Mr Pasha, who is managing the circulation from the NRI platform, which is widely reachable all over the world.
I also CCD this message to Mr Shamim Ishaq Bhai, Who is one of the most senior people from AMU in Australia, and I think he was in AMU during your time in Aligarh.
- Abbas Raza Alvi (Sydny)
President, Indian Crescent Society of Australia Inc.
[***Brief introd. - Abbas Raza Alvi*** *(Aligarh 1969-1977, Bsc, Engg.)*
Proficient in: English, Hindi, Urdu, Russian & Punjabi,
•Compiled a poetry book "Guldasta" of 47 Australian poets in Urdu and Hindi. "Guldasta" provides readers with the feelings of the world peace and harmony in the Indian community. "Guldasta" was released in September 2010.
•Composed & produced "Dooriyan", Australia's first CD capturing the emotional ties of Australian migrants.]

Thanks for sending the first and second issues of **Aligarh Diaspora**. Both the issues form a very interesting reading material.
My heartiest greetings on taking this useful initiative for Aligs all over the world. May it last very long!
- Prof. Muhammad Iqbal,
PhD, FNASc., Ex. Chairman Botany, Jamia Hamdard, New Delhi

میں ایک جز وقتی ادیب ہوں۔ روزانہ کی کاروباری مصروفیات سے وقت چرا کر ریزہ ریزہ معلومات اکٹھی کرتا ہوں اور پھر اس پر غور و فکر کر کے کچھ لکھ لیتا ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ مختصر سے علم اور مختصر سی محنت ہی کو وجہ توجہ بنا دیتا ہے۔ آپ نے علی گڑھ پر جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ خوب ہے۔ ان شماروں سے استفادہ کروں گا۔

منیر فرشوری کے والد قمرالدین مرحوم کا میں شاگرد رہا ہوں۔ آپ نے ان پر جو نوٹ لکھا وہ دلچسپی سے پڑھا۔

آجکل اختر انصاری مرحوم کے خطوط پر حواشی لکھ رہا ہوں۔ بڑے دلچسپ خط ہیں۔ **- شمس بدایونی** (علی گڑھ)

***